...ن و معارف قرآنیہ کا سلسلہ نمبر ۱

تلک الامثال نضربها للناس وما یعقلها الا العالمون

امثال القرآن

(مؤلفہ)

عرفانی الکبیر

مطبوعہ

اسلامی پریس بازار نور الامراء حیدرآباد دکن

تعداد جلد (۵۰۰) قیمت عہ سکہ ہند و سکہ پاکستان علاوہ محصول ڈاک

انتساب

ان تمام مخلص دوستوں کے نام جو قرآن کریم کے حقایق و معارف کی اشاعت کیلئے حقیقی اور عملی جوش رکھتے ہیں

اور

اس سلسلہ کے مستقل معاونین ہیں۔

اے بے خبر بخدمت قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلے علیٰ رسولہ الکریم

عرضِ حال

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ اس نے پھر اپنے فضل وکرم سے مجھے توفیق بخشی کہ میں قرآن کریم کے حسن وجمال کو امثال القرآن کے رنگ میں پیش کرنے کے قابل ہوا۔ یہ سراسر اسی کا کرم ہے کہ اس مشتِ خاک کو اس نعمت سے نوازا یہ سلسلہ حقائق ومعارف قرآنیہ کا دراصل اتقان جدید کا ایک خاکہ ہے میں نے ایک راہ پیدا کی ہے قرآن کریم میں تدبر کرنے والے اہل علم نفس مطہر لے کر قرآن کریم کے عجائبات مغرب زدہ اور مغربی اقوام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اس لئے کہ یہ زمانہ اشاعت علوم قرآنیہ کے لئے مخصوص ہے اور قرآن کریم کے ذریعہ اظہار الاسلام مقدر ہے۔

میں پھر اللہ تعالےٰ کی حمد کے گیت گاتا ہوں کہ اس نے اس پیرانہ سالی میں میری زبان قلم کو قوت بخشی اور اسی نے مجھے

مخلص عطا فرمائے۔ جو میرے اس سلسلہ تالیفات میں خاص طور پر معین ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو نیک جزا دے اور انکے اخلاص اور عملی مساعی کو قبول فرمائے۔ آمین

میں چاہتا ہوں کہ ہمارے احباب ہمیشہ اس شعر کو، زیر نظر رکھیں ؎

اے بے خبر بخدمت قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

خاکسار عرفانی الکبیر
۱۵ رمضان المبارک ۱۳۷۱ھ م ۹ جون ۱۹۵۲ء

فہرست مضامین امثال القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

امثال القرآن

ابتدائی کلمہ

جیساکہ میں نے عرض حال میں بیان کیا ہے اس کتاب کے لئے محرک سورۃ العنکبوت کی ایک آیۃ ہوئی پھر جب میں نے اس پر غور کیا تو حقائق و معارف قرآنیہ کا اس خصوص میں مجھے ایک بحر رواں نظر آیا۔

میں نے اس سلسلۂ تالیفات میں آئمہ سلف کی ان کوششوں کی ہمیشہ ستائش کی ہے جنہوں نے مختلف رنگوں میں قرآن کریم کی خدمت کی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مفسرین نے بعض اوقات اسرائیلیات کو بھی عجائبات سمجھ کر حقائق قرآنیہ کے سلسلہ میں لے لیا جس سے بعد میں نقصان بھی ہوا۔ مگر اس سے ان کی خدمات کے احترام میں فرق نہیں آسکتا۔

امثال القرآن کے سلسلہ میں میں نے حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی اتقان کو دیکھا تو انھوں نے پہلے بزرگوں کے کارناموں کا بھی اس خصوص میں ذکر کیا ہے مگر وہ میرے سامنے نہیں میرا اپنا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم نے خود ایک طریق فہم قرآن کریم کے لئے دیا ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

قلب سلیم لے کر قرآن مجید میں غور وفکر اور دعاؤں کے ذریعہ حل مشکلات قرآن کریم کو آسان کر دیتا ہے اور وہ تو ذکر کیلئے آسان ہی ہے بہر حال میں نے حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے اس باب کو پڑھا جو امثال القرآن پر ہے اسمیں انہوں نے آئمہ سلف کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اگر کوئی بات مجھے عصر حاضرہ کی ضرورت کے لحاظ سے، مناسب اور اہم معلوم ہوئی۔ تو میں آخر میں اس کا ذکر کروں گا سر دست تو میں اس رزق کریم کا بیان کروں گا۔ جو اللہ کریم نے اپنے فضل سے مجھے عطا فرمایا ہے اور اس باب میں سب سے اول میں قرآن مجید کے اسلوب بیان کی خصوصیتوں میں سے اس خصوصیت کو بیان کرتا ہوں جو امثال کے رنگ میں ہے۔

قرانی اسلوب بیان کی ایک خصوصیت

قرآن کریم کے طرز بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عظیم الشان صداقتوں اور حقائق کو عام فہم مثالوں کے ذریعہ پیش کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مثال فہم انسانی کے لئے سہولت پیدا کر دیتی ہے اور مشکل سے مشکل

اور دقیق سے دقیق مضمون آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور یہ امر انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ مثال کا استعمال ہر ملک اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے اور حسن کلام کا یہ ایک جزو ہے۔ اور تفہیم مطالب کا ایک ذریعہ انبیاء علیہم السلام اور دوسرے رہنماؤں نے بھی اس طریق کو اختیار کیا ہے۔ جس طرح یہ استعارہ کنایہ وغیرہ حسن کلام کے جزو ہیں۔ اور وہ ادائے مطالب میں ایک لطافت اور خوبی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح امثال بھی ایک خصوصیت پیدا کرتے ہیں۔

غرض قرآن کریم نے اس اقرب الی الفہم طریق کے ذریعہ بھی اپنی صداقتوں کو پیش کیا ہے۔ مگر دوسری مثالوں اور قرآن کریم کی پیش کردہ مثالوں میں ایک بین فرق ہے۔ قرآن کریم جو مثال پیش کرتا ہے وہ اپنے اندر مختلف قسم کی خوبیوں کی جامع ہوتی ہے وہ نہ صرف علوم متعلقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ بلکہ انسانی نفس کے تزکیہ و طہارت کے لئے ایک سہل اور آسان طریق پیش کرتی ہے۔ اور صداقت کے باریک پہلوؤں کو نمایاں اور مشکلات کو قریب الفہم کر دیتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ مثالیں ان مختلف مقاصد کے زیر نظر پیش کی ہیں جو انسانی ضابطہ حیات کے مختلف شعبوں پر موثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ مقاصد امثال کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے۔

(دیکھو سورہ بنی اسرائیل پارہ ۱۵ رکوع ۱۰ آیۃ ۸۹)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا۔

اور یقیناً قرآن کریم میں لوگوں کے فائدے کے لئے ہر قسم کی **مثالیں** بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کی ہیں۔ (با ایں) اکثر لوگوں نے انکار کیا۔ اور اقرار کیا تو صرف کفر کا۔

قرآن کریم کی یہ آیت صراحت سے ظاہر کرتی ہے کہ تمام مطالب عالیہ کو قرآن کریم مختلف پیرایوں سے بیان کرتا ہے تاکہ ہر عقل کا انسان اس سے فائدہ اٹھائے اور اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو اس نے بیان نہ کیا ہو وہ سیاست کا ہو یا تمدن ومعاشرہ کا انسان کی اہلی اور منزلی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ یا اس کی قومی یا اجتماعی حیات سے قرآن کریم اسے مکمل طور پر پیش کرتا ہے۔ اور ایسے رنگ میں کہ بآسانی سمجھ آجائے۔ **مثل** کے لفظ میں اس کے تمام مطالب کو جمع کر دیا ہے۔ یعنے وہ کلام مدلل ہوتا ہے، اور اپنی خوبیوں اور ندرت اور دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بے مثال ہوتا ہے۔

اور اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قرآن کریم نے بیان نہ کیا ہو۔ اور اسے بذریعہ **مثال** نہ سمجھا دیا ہو۔ **سورۃ بنی اسرائیل** کی مندرجہ بالا آیت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے

کہ مختلف اسالیب بیان اس لئے اختیار کئے گئے ہیں تاکہ اس کی قوت یقین ترقی کرے اور انکار کے اسباب کو دور کرے مگر تھوڑے ہوتے ہیں جو اس سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثریت منکرین کی ہوتی ہے اس آیت میں قرآن کریم نے ایک بدیع اسلوب بیان اختیار کیا ہے بظاہر الفاظ ایک ہیں مگر صرف بعض الفاظ کو بدل کر ایک نہایت عظیم الشان اور جدید مطلب بیان فرمایا ہے۔

دل میں یہی ہے ہر دم تیرا صحیفہ چوموں
قرآں کے گرد گھوموں کعبہ میرا یہی ہے

اسی مضمون کو سورہ کہف رکوع ۹ آیت اول میں اسطرح پر بیان کیا ہے۔ اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے فایدہ کے لئے ہر امر کو مختلف پیرایوں (مثالوں) میں بیان کیا مگر انسان سب سے بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل رکوع ۶ کی آیت اول میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ مختلف اسالیب بیان اختیار کرنیکا مقصد صرف تذکیر ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّکَّرُوْا وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا

اور یقیناً ہم نے اس قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے اظہار حق) کیا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں (مگر بجائے اس کے) اس سے بھی وہ نفرت میں ترقی کرتے ہیں۔

غرض سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت میں مقصد تذکیر قرار دیا او
یہی مقصد ہر جگہ مدنظر رہے۔ مجھے ان لوگوں کے فہم و فراست سے
کام نہ لینے پر افسوس ہوتا ہے۔ جو قرآن کریم کے بار بار ادائے مطالب پر
اعتراض کرتے ہیں بحالیکہ فطرت انسانی کے اندر عمل تکرار موجود ہے
علاوہ بریں یہ علمی نکتہ ہے کہ ایک قادر الکلام خطیب وہی ہو سکتا
ہے جو اپنے مقصد کو مختلف پیرایوں میں بیان کرنے پر قادر ہو یہ امر تو
قوت بیان اور قوت استدلال کی روح ہے۔ چہ جائے کہ اس پر
اعتراض ہو۔ قرآن کریم اس رنگ میں عدیم المثل اور یہ اس کا
اعجاز بیان ہے۔

میں بیان کر رہا تھا کہ قرآن کریم کے اسلوب بیان کی ایک
شان ضرب الامثال بھی ہے ضمناً ذکر تصریف البیان کا آگیا جو ضرب
الامثال ہی کے ضمن میں آجاتا ہے جیسا کہ خود قرآن کریم دوسرے مقام پر بیان
پیش کرتا ہے سورۃ زمر رکوع ۳ آیۃ ۲۶، ۲۷ میں فرمایا :-

(۲۶) وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ
كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝

(۲۷) قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ:- (۲۶) اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے نفع
کے لئے ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت
حاصل کریں۔

(۲۷) یہ قرآن عربی زبان میں ہے (جو خود بیان کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ اور اس قرآن میں کوئی تعلیم ایسی نہیں جسمیں کسی قسم کی کجی ہو۔ ایسی واضح اور سیدھی تعلیم کیوں پیش کی ہے) تاکہ انسان تقویٰ کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کریں۔ اور ہر قسم کے دکھوں سے نجات پائیں۔

یہاں قرآن کریم نے صرّفنا کی بجائے ضربنا کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ضرب المثل عام محاورہ ہے۔ اور ضرب المثل وہ ہوتی ہے جو اپنے ایک لمبے تجربہ کے بعد ایک حقیقت کے طور پر مستعمل ہوتی ہے۔ تو یہاں جو بیان فرمایا کہ قرآن کریم میں ہر مثل کو بیان کیا ہے اور اس بیان میں لفظ **ضرب** کا استعمال فرمایا۔ جو اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ صداقتیں کسی رنگ میں بھی غور کرو صداقت ہی ثابت ہوتی ہیں۔ ٹھونک بجا کر دیکھ لو۔

یہاں اس ضرب امثال کا مقصد وہی تذکیر و **موعظت** بیان فرمایا اور **قرآن کریم** کی زبان کا ذکر بھی خصوصیت سے کر دیا۔ اس لئے کہ عربی ہی وہ زبان ہے۔ جو اپنی وسعت کے لحاظ سے مطالب کو وضاحت سے بیان کرسکتی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی بتا دیا کہ **قرآن** کریم کی تعلیم **غیر ذی عوج** ہے۔ اس میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں ہے۔ وہ **صراط مستقیم** ہے۔ قرآن کریم سورہ روم آیت ۵۸ میں بھی اسی طرز کلام کو اختیار کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝

ترجمہ :- اور یقیناً ہم نے تو اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔ (مگر منکروں کا یہ حال ہے کہ) اگر تم انکے سامنے کوئی بھی آیۃ پیش کرو تو وہ یہی کہیں گے کہ تم صرف دہوکا دیتے ہو۔

اس میں قرآن مجید کی ہدایات اور آیات سے محروم ہوجانے کا ذریعہ بتا دیا ہے کہ قرآن کریم تو انسانی نفع رسانی کا ذریعہ ہی ہے اور اس مقصد کو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔ لیکن جب انسان انکار کرتا ہے تو وہ ایک حقیقت کو بھی باطل قرار دیتا ہے۔ اس طرح پر اسکی قوتِ فیصلہ مرجاتی ہے۔

(۱) مکڑی کی مثال

(۱) مکڑی کی مثال

قرآن کریم پارہ ۲۰ میں ایک سورۃ کا نام عنکبوت ہے۔ یہ مکی سورۃ ہے۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے ایک مثال رکوع ۴ آیۃ ۴۱ میں مکڑی کے گھر کی بیان کی ہے۔ چنانچہ فرمایا

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے سوا (غیروں کو) ولی بناتے ہیں مکڑی کی مثال کی طرح ہے وہ ایک گھر بناتی ہے اور وہ گھر یقیناً ہر قسم کے گھر سے کمزور ہوتا ہے۔ کاش (یہ مشرک) جانتے (۴۱) بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جن اشیاء کو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں اور العزیز الحکیم ہے (۴۲) اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے فائدہ کیلئے بیان کرتے ہیں مگر ان کو سوائے ان لوگوں کے جو علم رکھتے ہیں کوئی نہیں سمجھتا (۴۳)

ایک خاص ترتیب قرآن کریم کی بعض سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ اور جن سورتوں کو مقطعات سے شروع کیا جاتا ہے

وہ مقطعات اس کے حل کے لئے ایک کلید کا کام دیتے ہیں مجھ کو یہاں مقطعات کے متعلق تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے بلکہ ایک خاص ترتیب کا اظہار مقصود ہے اس سورۃ سے پہلی تین سورتوں شعرا۔ نمل۔ قصص ایک گروپ کی سورتیں ہیں جو طسم سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۃ نمل کو صرف طس سے شروع کیا گیا ہے

ان مقطعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص موضوع اور گروپ کی سورتیں ہیں اور جب ہم ان کے مضامین پر غور کرتے ہیں تو حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ اگرچہ میری اس کتاب کے موضوع سے کچھ الگ ہونا پڑتا ہے۔ مگر میں اس غرض سے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے

سورۃ الشعرا و نمل و قصص پر اجمالی نظر

ان تینوں سورتوں کا اجمالی خاکہ بیان کرتا ہوں جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو مضمون میں ایک اتحاد اور سلک منتظم نظر آتا ہے۔ تینوں میں موسوی سلسلہ کی ابتدا اور ارتقاء کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کی تاریخ کو گویا بطور پیشگوئی بیان کر دیا ہے۔ تینوں سورتوں میں یہ اسلوب مختلف حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دشمنوں کی ناکامی اور آپؐ کی فتحمندی کی بشارت دی ہے۔ گویا ان تینوں سورتوں میں بظاہر موسوی سلسلہ کی تاریخ کا ایک باب ہے لیکن حقیقت میں رسالت محمدیہ کی تاریخ کو دوہرایا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک محقق اس کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کہ سورۃ الشعرا میں فرعون اور موسیٰ کے مقابلہ اور فرعون کی ہلاکت اور حضرت موسیٰؑ

کی کامیابی کا تفصیلی ذکر ہے۔ اور سورۃ النمل میں اس عظمت و شوکت کا بیان ہے جو موسوی سلسلہ کو حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں ملی اور سورۃ القصص میں موسوی ہجرت کا ذکر ہے۔ اور جب ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ اس کی مخالفت اور آپؐ کی کامیابی اور ہجرت کے واقعات پر غور کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ

موسٰیؑ کے بیان میں مثیلِ موسٰی کو نمایاں کیا گیا ہے

غرض حروف مقطعات سے شروع ہونے والی سورتوں کا ایک گروپ ہوتا ہے اور یہ گروپ پہلی سورۃ سے ایک خاص ربط رکھتا ہے اور ترتیب کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔

سورۃ عنکبوت کا گروپ

اس سورۃ عنکبوت سے ایک نیا گروپ شروع ہوتا ہے بظاہر یہ ایک نئے باب اور نئے مضمون کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں قرآن کریم کی اصل ترتیب و ربط کے لحاظ سے وہ ایک ہی سلسلہ ہے پچھلی سورۃ کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے اور اب ان سورتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی جو ہجرت نبوی کے بعد نمایاں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کن امور کی ضرورت ہے۔ اس کی تفصیل کا آغاز ہوتا ہے۔ کہ حقیقی کامیابی کے لئے صرف منہ کا اقرار ایمان کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف قسم کے مشکلات و مصائب کی ہفت خوان طے کرتے ہوتے ہیں جو تزکیہ نفس اور قوت استقامت کی تربیت اور صبر و ضبط اور جذبات پر حکومت کے لئے ضروری ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے

اور مکہ میں مشرکین آپؐ کے مقابلہ میں تھے اور آپؐ کی ابتدائی دعوت کو قبول کرنے والے کمزور اور غریب لوگ تھے جو مشرکین کا ہدف ملامت اور تختہ مشق مصائب بنے ہوئے تھے اور قدرتی طور پر بے بصیرت لوگ جو واقعات کو انجام کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے ان مصائب و مشکلات کو تباہی کا انتشان سمجھتے تھے لیکن حقیقت اس کے برخلاف تھی۔ یہی مصائب کامیابی اور فتح عظیم کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی ہستی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا

کھلا کھلا ثبوت ہو گئے

مختصر یہ کہ مکی حالات کے لحاظ سے ابتدائی جماعت کو تسلی دی کہ تمہاری کامیابیوں کے لئے تمہارے اندر ایک انقلاب اور ایک نئی روح کا نفخ ضروری ہے۔ جو تزکیہ نفس کے نام سے موسوم ہے اور اس کے لئے مصائب کے دروازے سے گذرنا لازم ہے۔

اور مشرکین کو بتایا کہ تم اس جماعت کیلئے جو تمہارے نزدیک بے حقیقت اور کمزور ہے مختلف قسم کے منصوبے اور انکے ہلاک کرنے کے لئے طرح طرح کے جال بچھاتے ہو مگر یاد رکھو کہ تمہارے منصوبے اور تمہارے یہ نام نہاد معبودان باطلہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور اور بے حقیقت ہیں اس رنگ میں اس سورۃ میں یہ مثال بیان کیگئی ہے۔

تاریخی حیثیت

میں نے یہ کہا ہے کہ جن سورتوں کے مقطعات ایک ہی ہیں۔ وہ ایک گروپ کی سورتیں ہیں اس سورۃ کو جو الٓمٓ سے

شروع کیا گیا ہے اس کے بعد کی تین سورتیں الروم۔ لقمان۔ السجدہ بھی الٓمٓ سے شروع کیگئی ہیں اور ان چاروں سورتوں میں مضمون واحد

اسلام کی کامیابی ہے۔

اس کیلئے جن اسباب اور ذرائع کی ضرورت ہے اسکی تفصیل مختلف پیرایوں میں بیان کی ہے۔

ایک وہم کا ازالہ

یہاں ایک وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے شروع میں سورۃ البقرہ جو الٓمٓ سے شروع ہوتی ہے یا سورہ آل عمران وہ اس گروپ سے یا یہ گروپ اس گروپ سے کیا تعلق رکھتا ہے اور انکی ترتیب میں ایک فصل کیوں ہے؟ یہ سوال قلت فہم سے پیدا ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ اور اُس گروپ میں اللہ تعالیٰ کے علم کی تجلیات کو پیش کیا ہے اور اس گروپ میں بھی جو اس سورۃ عنکبوت سے شروع ہوتا ہے اللہ کے علم کی شان کو پیش کیا ہے۔ مگر رنگ دوسرا ہے اور مقصد بلحاظ خطاب الگ ہے۔ سورۃ بقرہ میں خطاب کا موضوع کفار ہیں۔ اور یہاں مومن وہاں کفار کی ناکامیوں کے متعلق علم الٰہی کی ایک جداگانہ شان ہے۔ اور یہاں مومنین کی عملی قوتوں کی تربیت کے لئے اس کا دوسرا رنگ ہے۔

ایک لطیف ترتیب

یہ ایک نہایت لطیف مضمون اور اعجازی ترتیب ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ اس کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا جاوے تاکہ قرآن کریم کی اعجازی شان نمایاں ہو مگر یہ سلسلہ آمد معارف ایسا ہے کہ پھر ختم نہیں ہو سکتا اس لئے مختصراً کچھ کہہ جانا چاہتا ہوں۔ میرا مذہب اور

عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب نزولی اور ترتیب ترتیلی میں ایک خاص ربط ہے ہر آیت اپنی پہلی آیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اور وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ الٓمٓ سے شروع ہونے والی سورتوں میں جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ

اللہ تعالٰی کی صفت علم کا مظاہرہ ہے

میں تمام ایسی سورتوں میں اشتراک علمی کو الگ الگ بیان کرسکتا ہوں (بحمد اللہ) مگر صرف اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے دو تین مثالیں بتا دیتا ہوں۔ پھر طالب حق اور قرآن مجید کے حقائق و معارف کا شیدائی خود غور اور تدبر کرے گا تو اسے حقائق قرآنیہ کے گوہر ہائے نایاب سے دامنِ دایمان وایقان بھرنے کی مسرت حاصل ہوگی۔

سنو! اور غور کرو۔

(۱) الٓمٓ سورۃ بقرہ کے ابتدا میں آیا اور اس کا مفہوم یہ ہے انا اللہ اعلم۔ میں اللہ وہ ہوں جو تمام علوم کا سرچشمہ اور جس کے علم سے بڑھ کر تو کیا برابر بھی کسی کا علم نہیں ہوسکتا۔ اس علم اکمل کا مظاہرہ قرآن کریم کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا

ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین

علم صحیح اور کامل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک اور حق محض ہو اور اسکی عملی کیفیت یہ ہو کہ صحیح رہنمائی کا کام دے اس لئے قرآن مجید کے متعلق کہدیا کہ یہ محفوظ مکتوب ایسی کتاب ہے کہ

وہ سراسر علوم صحیحہ اور صداقتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تعلیم و ہدایت میں کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا اور اس کی عملی تاثیرات یہ ہیں کہ ان پر ہی عمل کر کے ایک عام انسان متقی اور باخدا انسان بن جاتا ہے۔ اسی مفہوم کو زیر نظر رکھو اور پھر ان سورتوں پر غور کرو جیسے مثلاً آل عمران میں فرمایا

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ الآیۃ

اس میں اللہ کی توحید ذاتی اور صفاتی کو پیش کر کے الحی القیوم صفات کو ایک خاص مقصد سے پیش کیا اور فرمایا جو کتاب تجھ پر نازل کی ہے وہ اپنے اندر حق کو لئے ہوئے ہے حق باطل کی ضد ہے اور حق صدق کو بھی کہتے ہیں میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا قرآن مجید میں یہ لفظ پیشگوئی پر بھی بولا گیا ہے۔ جو خود اپنے اندر علمی قوت رکھتی ہے بہر حال لاریب کا جو مفہوم ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کریم نے سورۃ آل عمران میں اسی حقیقت کا نام حق رکھا تاکہ اس اشتراک کی طرف بآسانی رہنمائی ہو جو الٓمّٓ والی آیات میں ہے۔

اسی اصل کو پیش نظر رکھ کر اس پہلے گروپ کو دیکھئے جو سورۃ بقرہ سے شروع ہوتا ہے اب اس جدید گروپ پر جو سورۃ عنکبوت سے شروع ہوتا ہے غور کرو۔

سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم کے متعلق میں بعد میں بیان کروں گا اس لئے کہ یہ مفہوم و مقصود میں ایک لطافت اور نزاکت رکھتا ہے مگر سورۃ لقمان اور سجدہ میں صراحت ہے پس اس لطافت اور صراحت پر بھی کچھ بیان کر دوں گا (حولہ)

سورۃ لقمان کا ابتدا تو بہت ہی واضح ہے فرمایا

الٓمّٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں ۰ جو احسان کرنے والوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہیں

اس کے بعد ان محسنین کے صفات کو بیان کیا ہے اور جس طرح پر سورۃ بقرہ میں متقین کا لفظ رکھ کر ان کے ایمانی اور عملی صفات کا اظہار کیا ہے اسی طرح یہاں محسنین کے ایمانی اور عملی صفات کو بیان کیا اس ایمانی قوت اور عملی طاقت کا نتیجہ جیسے سورۃ بقرہ میں کامیابی اور فلاح بتایا یہاں بھی ان محسنین کو اس فلاح کی بشارت دی۔

اور اسی طرح پر سورۃ السجدہ کو اسطرح پر شروع فرمایا

الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ

میں اللہ جو کامل علم رکھنے والا ہوں۔ اس کتاب کا نزول رب العلمین کی طرف سے ہے اور یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے۔

ان مختلف مقامات پر مختلف صفات کا ذکر بھی اپنے اندر علم کی شان بلند کو لئے ہوئے ہے مثلاً اس مقام پر رب العالمین کی صفت کا اظہار کیا اسمیں اس بات کو ذہن نشین کرنا ہے کہ قرآن کریم تمام دنیا کی رہنمائی کرنے کیلئے ہے اور تمام دنیا میں اس کی تبلیغ و دعوت پہونچے گی اور ربوبیت کی صفت کا اظہار اس لئے فرمایا کہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوگا

سورۃ لقمان میں کتاب کی صفت الحکیم بیان کی ہے یعنی اسکا

اسلوب بیان نہایت صحیح ہے۔ اس لئے کہ حکمت کہتے ہیں وضع الشئے فی محلہ کو اور اس کی جو تعلیم ہے وہ سراسر حکمت ہے برمحل ہے اور مضبوط و مستقل ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے والے لوگ محسن ہو جاتے ہیں اور وہ ہدایت اور رحمۃ ربی کے مورد ہوتے ہیں اور انمیں عملی رنگ میں وہ صفات اور کمالات پیدا ہو جاتے ہیں جو آگے بیان ہوئے ہیں۔(قرآن مجید میں اگلی آیات پڑھو اور غور کرو) غرض ان دونوں سورتوں میں تو نہایت وضاحت کے ساتھ مطابقت مضمون نظر آتی ہے اب میں سورۃ عنکبوت اور الروم کے متعلق بحث کرتا ہوں۔

سورۃ عنکبوت کا ابتداء

اس سورۃ کو بھی الٓمّٓ سے شروع کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں ۝ کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ صرف یہ کہہ کر کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اور وہ ابتلاؤں، اور آزمائشوں میں نہ ڈالے جائیں گے۔

اور (ہمارا قانون یہی ہے) یقیناً ان سے پیشتر جو (ایمان لائے) انکو بھی آزمائشوں اور ابتلاؤں میں سے گذارا اور ان امتحانوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صادق اپنے صدق کو اور کاذب اپنے کذب کو جان لیں اور ہم ان کے صدق اور کذب پر نشان لگا دیں (یعنے امتیاز پیدا کر دیں۔)

اس آغاز میں علم الٰہی کا لطیف پیرایہ میں ذکر کیا ہے یعنی اس علم کا جس کا اظہار آئندہ میں ہے اس طرح پر ہوگا کہ مومن اپنے تزکیہ نفس کی تکمیل کیلئے مختلف قسم کے امتحانوں سے گذریں گے تاکہ ان کے اندر ایمانی قوت مضبوط ہو۔ اور انہیں اپنے جذبات نفس پر کامل حکومت حاصل ہو جائے۔ امتحان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ممتحن کو علم نہیں ہوتا جیسا کہ بعض احمقوں نے اس قسم کی آیات پر اعتراض کیا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ کو علم نہ تھا ایسا ہرگز نہیں۔ تو سارے علوم کا سرچشمہ ہے یہ ابتلا انسان کے علم میں اضافہ کے لئے ہوتا ہے تاکہ اس کو معلوم ہو کہ کس قسم کے قویٰ اور جذبات اللہ تعالیٰ نے اس کو دیئے ہیں۔ اور امتحان کے بعد ایک یقین اور معرفت سے لبریز دل لے کر نکلتا ہے پس اس سورۃ میں علم الٰہی کا مظاہرہ مومنین کے تکمیل طہارت نفس کے لئے امتحان کے ذریعہ کیا گیا ہے اور جو شخص ہر قسم کے ابتلاؤں میں پڑ کر صاف نکلتا ہے اس کا سینہ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک ہو جاتا ہے کسی قسم کی میل کچیل نہیں رہتی اس لئے یہاں فتنہ کا لفظ اختیار کیا ہے۔ جو اپنی حقیقت میں اس مفہوم کو لئے ہوئے ہے۔ کہ جیسے سونا کٹھالی میں (آگ میں) اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ اسکو میل کچیل سے پاک کر کے کندن بنا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کے تکمیل نفس کے لئے ابتلاؤں میں ڈالتا ہے۔ اور یہ علم الٰہی کے کمال کا ظہور ہے۔ پس یہ نہایت لطیف پیرایہ میں اللہ کے علم کی قوت کو پیش کیا ہے۔ اور اس طرح پر نتائج کے لحاظ سے وہی مقصد حاصل ہے۔ سورۃ الم وغیرہ میں اس علمی کمال کو ایک پیشگوئی کے رنگ

میں پیش کیا ہے اور اس کے پورا ہونے کو ایک قوت یقین کے ساتھ عربی زبان کے کمال کے اظہار کے لئے سیغلبون کے س کو استعمال کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں اس قدر بیان کے بعد مجھے لطافت اور صراحت بیان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مکڑی کی مثال اور اسکے مقاصد

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور یہ بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں کن امور کی طرف توجہ دلائی ہے قرآن مجید کے حقایق تو لاانتہا ہیں اور کبھی ختم نہیں ہو سکتے اس لئے جو میں سمجھتا ہوں اسے پیش کرتا ہوں۔ اس مثال کو اللہ تعالےٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذکر اور انکی دعوت توحید اور انکی قوموں کے انکار اور اس انکار کے نتیجہ میں بعد کے حالات کیلئے پیش کیا ہے اور یہ سب کچھ حضورؐ کی صداقت کے لئے بطور دلیل ہے۔

مکہ معظمہ میں جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں تو اس وقت کے موجودہ مشرک ہی تھے انہیں بتایا کہ پہلی قوموں نے خدا کے ساتھ جن چیزوں کو شریک کر کے معبودان باطلہ ٹھیرایا اور اپنے نبیوں کی مخالفت کی اور ہر قسم کے دکھ دیئے آخر وہ اپنے تمام منصوبوں میں ناکام و نامراد ہوئے اور انبیاء علیہم السلام کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تم منصوبے کرتے ہو تو یاد رکھو کہ

تمہارے منصوبے مکڑی کے گھر کے مشابہ ہیں

مکڑی گھر کسطرح بناتی ہے

قرآن مجید ہر قسم کے علوم کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ حشرات الارض میں سے بعض کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے تو اس لئے نہیں کہ عام طور پر ذکر آگیا ہے۔ نہیں بلکہ اس میں ان خصوصیات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو اس میں ہیں چنانچہ اس مقام پر اس مثال کو بیان کر کے فرمایا

تلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العلمون

یہ امثال ہم لوگوں کے فایدہ کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان مفاد کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ کوئی عبث کام نہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو باطل پیدا نہیں کیا

ربنا ما خلقت هذا باطلا

غرض علم الحشرات کے ماہرین بیان کرتے ہیں کہ مکڑی کے جسم میں چار ہزار نالیاں ہوتی ہیں اور پھر آگے چار سوراخ ہوتے ہیں ہر ایک میں سے ایک ایک ہزار تار نکلتے ہیں اور آخر دم کے پاس ایک سوراخ ہوتا ہے جس میں سے یہ چار ہزار تار مل کر گذرتے ہیں۔ اور جال کا ایک تار بنتا ہے۔ اور وہ مختلف رنگ کے تار نکال سکتی ہے غرض ایک دنیا اس کے اندر ہے اور باوجود اتنی ہوشیار اور صنعت کار ہونے کے اس کا گھر سب سے بودا قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح پر شرک کے عقیدہ کی بنیاد صرف اندرونی تخیلات پر ہے اور مکہ والوں کو اس مثال میں بتایا ہے کہ تم جو منصوبے نبی کریم صلعم کے مقابلہ میں کرتے ہو اور اپنی دماغی تجویزوں سے جو جال آپ اور آپ کے صحابہ کے لئے تنتے ہو یہ سب بے حد کمزور ہیں۔

اس مثال میں مکڑی کو پیش کر کے یہ بھی بتایا کہ مشرک کبھی ایک بت یا عقیدہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور وہ مختلف اور متعدد معبود تجویز کرتا رہتا ہے اور اپنے اس عمل سے گویا ہر پہلے عقیدہ کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑتا رہتا ہے۔ اسی لئے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ

شرک کی بنیاد کسی علمی دلیل پر نہیں ہوتی

قرآن کریم نے جہاں شرک کا رد کیا ہے اسی چیز کو پیش کیا ہے۔ غرض اس مکڑی کی مثال میں حضور علیہ السلام کو یقینی ٹھیرایا ہے اور اپنی صفت العزیز اور الحکیم کا اظہار کیا جو غلبہ اور حکمت کو ظاہر کرتی ہیں۔

مکڑی کی اس مثال میں مشرکین کی تردید کے علاوہ جو نتائج، پیدا ہو سکتے ہیں اس کے لئے اہل علم کو توجہ دلائی ہے اور حشرات الارض کے ماہرین اپنی تحقیقات کے بعد جو نتائج جب بھی پیش کریں گے تو اس آیت کی صداقت کی شہادت دیں گے۔

وللہ الحمد اولاً واخراً وظاھراً وباطناً

(۲) مکھی کی مثال

تمہیدی نوٹ

مکڑی کی مثال کے سلسلہ میں مکھی کی مثال جو قرآن کریم نے پیش کی اکا بیان کرنا ایک ترتیب طبعی کو چاہتا ہے۔ مکڑی مکھی کے مقابلہ میں ایک کمزور شئے ہے۔ لیکن وہ اپنے تار عنکبوت ہی کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے۔ اور مکھی باوجود اپنی آزادی اور قوت پروازکے وہ مکڑی سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم ان مثالوں کو بطور ایک عام مثال کے پیش نہیں کرتا وہ اس سلسلہ میں انسان کی قوت فکر کو ترقی دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے ایک قاعدہ کلیہ یہ تسلیم کیا کہ **اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو باطل پیدا نہیں کیا** اور زمین و آسمان کے اندر کی ساری کائنات کو انسان کے نفع اور فائدہ کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ تو جب قرآن کریم کائنات کی کسی چیز کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس مخلوق کے متعلق ہر قسم کی تحقیق اور تفتیش کیلئے تحریک کرتا ہے۔

پس قرآن کریم مکھی کی مثال ایک تسہیل فہم کے لئے پیش نہیں کرتا ایک خاص امر کی وضاحت اور صداقت ہی کے لئے پیش نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے متعلق ایک علمی تحقیق کے راستہ کو ہموار کرتا ہے۔

مکھی کی مثال

اب میں قرآن کریم سے اس مثال کو پیش کرتا ہوں (دیکھو قرآن مجید سورۃ حج پارہ ۱۷ آخری رکوع آیۃ ۷۴)

يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ط إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ط وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ط إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

لوگو! ایک مفید بات (مثال) بیان کی جاتی ہے اسے توجہ سے سنو! وہ (معبودان باطلہ) جنکو تم اللہ تعالے کے سوا پکارتے ہو ایک مکھی (باہم اکٹھے ہو کر بھی) پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس چیز کو نہیں لے سکتے (یہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ جو طالب اور مطلوب دونوں ہی بے بس اور کمزور ہیں (آہ!) ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے مقام قدرت و قوت کی وہ قدر نہیں کی جو حق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی تو سراسر قوت اور غالب ہے۔

تفسیری نوٹ

قرآن کریم کے حقایق و معارف کو سمجھنے کے لئے اس امر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ایک مرتب اور منظم کلام ہے ہر آیۃ کا ہر لفظ ایک صحیح مقام اور باہم تعلق رکھتا ہے اسے اس مقام سے ہٹایا ہی نہیں جا سکتا اسی لئے قرآن کریم نے یہ دعوے کیا ہے لم يجعل له عوجا پس اس اصل ترتیب محکم کے مدنظر رکوع نمبر ۹ کو اس طرح پر شروع فرمایا

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے قرآن کریم ایک محکم نظام اور پرحکمت ترتیب رکھتا ہے۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کائنات عالم کو انسان کے منافع کے لئے تسخیر کا ذکر کیا۔ اور اس میں حقیقتاً اس امر کو واضح کیا کہ جو چیز انسان کی خادم ہے وہ اس کی معبود کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے آگے چل کر فرمایا۔ کہ

”وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے معبودان باطلہ کی عبادت کرتے ہیں جس کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی اور خود ان کے پاس بھی اس کے لئے کوئی علمی دلیل نہیں اور پھر یہ فیصلہ نمایاں ہو جائے گا۔ کہ مشرکین کی کوئی مدد نہ کر سکے گا۔“

یہ اسی رکوع کی آیۃ ۷۲ کا مفہوم ہے۔ اس طرح پر اللہ تعالیٰ نے ردشرک اور تردید معبودان باطلہ کے لئے انسانیت کے مقام اور کائنات کو اس کے لئے تسخیر اور پھر انعامات الٰہیہ کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ معبودانِ باطلہ کے پرستاروں کے پاس کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں اور اللہ تعالیٰ کے پرستار کے مقابلہ میں جب یہ مشرکین آئیں گے تو انہیں معلوم ہو جائیگا کہ وہ معبودان باطل تو درکنار کوئی بھی انکی مدد نہ کر سکے گا اور یہ دعوے ایک حقیقت ثابت ہو کر رہا کہ مشرکین مکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلہ میں ناکام اور نامراد رہے۔

ایک وہم کا ازالہ

قدرتی طور پر مشرکین کو خیال آتا تھا اور ظاہری اسباب اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان نہ رکھنے والے لوگ ان

ہی پر بھروسہ کر کے رائے قائم کرتے ہیں کہ ہماری طاقت بڑی ہے ہم ایک بڑی جماعت کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں وہ جماعت افراد کے لحاظ سے بھی اور کثیر التعداد معبودان باطلہ کے رنگ میں بھی ہے پس یہ اکیلا شخص جسکی کوئی طاقت اور جماعت نہیں اور اسکی امداد کا انحصار ایک معبود پر ہے۔ یہ ہمارے مقابلہ میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے اللہ تعالےٰ نے ان کے اس اندرونی خیال کا جواب دیا اور وہ اس طرح پر غرض اسی سلسلہ میں معبودان باطل کی تمام تر کمزوری اور شکست کا ذکر مکھی کی مثال سے کیا اور اس روزمرہ کے مشاہدہ کو رد شرک میں ایک فطری دلیل کی صورت میں نمایاں کیا۔

معبودان باطلہ کے مقابلہ میں اپنی تخلیق اور جسامت کے لحاظ سے کیا حقیقت ہے مگر باوجود اپنی اس کمزوری خلق کے اللہ تعالےٰ نے اس کو وہ قوت دی ہے کہ اگر وہ کوئی چیز چھین کر لیجاوے تو اس سے واپس نہیں لیجا سکتے

بصائر و عبر اس مثال کے اندر جو بصائر اور عبر ہیں ان پر غور کرو۔

اول جیسا کہ میں نے قرآن کریم کی اوپر بیان کردہ آیت سے استشہاد کیا کہ کائنات کی ہر شے کو اللہ تعالےٰ نے انسان کے نفع کیلئے مسخر کر دیا ہے اس اصل کے تحت غور کرو کہ مکھی کی تخلیق کس فائدہ کی حامل ہے اس غور کے لئے انسان کو ان علوم کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ جو حشرات الارض کے متعلق ہیں اور جنہوں نے قرآن کریم کے اس اصل پر دانستہ یا نادانستہ عمل کیا ہے انہوں نے متعدد قسم کے مفاد ان چیزوں سے پیدا کئے ہیں مجھے اس موقعہ پر صرف مکھی کا ذکر کرنا ہے۔

مکھی کا پہلا کام

مکھی کو اللہ تعالے نے من وجہ داروغہ صفائی کی صورت میں پیدا کیا ہے ہر قسم کی غلاظت کو مکھی چاٹ کر صاف کر دیتی ہے۔ روئے زمین کے ہر حصہ اور ہر جگہ پر بغیر اس خیال کے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ہر قسم کی غلاظت انسان پھینک دیتا ہے ناک کا رینٹھ۔ بلغم۔ بچوں کے پاخانہ وغیرہ اور سڑی ایسی چیزیں جنہیں مختلف قسم کے جراثیم بیماریوں کے ہوتے ہیں یہ مکھی انکوچٹ کر جاتی ہے افسوس ہے لوگوں نے اس فلسفہ کو یا تو سمجھا نہیں یا بہت ہی کم سمجھا ہے غور کر کے دیکھ لو جہاں غلاظت ہوگی وہاں مکھی آتی ہے جہاں ہر قسم کی صفائی ہو وہاں اس کا گذر نہیں یعنی وہ آتی ہی نہیں۔

اس طرح پر اللہ تعالے نے مکھی کو قدرتی سنیٹری نظام کے لئے مامور کر رکھا ہے۔ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مکھی مختلف قسم کے امراض پیدا کرتی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ تو امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے بطور ایک الارم کے آتی ہے۔ اسکی آمد جس مکان میں ہو یقیناً وہاں کسی نہ کسی قسم کی غلاظت موجود ہے اس لئے وہ اپنی آمد اور کثرت سے متنبہ کرتی ہے کہ اس کو صاف کر دو اور اس عمل صفائی میں اسکی مدد کرو۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتایا کہ مکھی کے ایک پر میں زہر اور دوسرے میں تریاق ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی شئے میں مکھی پڑ جاوے اور اس میں ڈوب جاوے تو وہ زہر تریاق ہو جاتا ہے۔ یا بے اثر ہو جاتا ہے۔ اور یہ تریاق اللہ تعالٰے

نے اس لئے اسکی حفاظت کے لئے رکھدیا کہ وہ تو غلاظت کو صاف کرنے کے لئے پیدا کیگئی ہے اگر وہ اس زہر کو جو چیٹ کرتی ہے دور کرنے کی اہلیت نہ رکھے تو اپنے کام سے بیکار ہو جاوے۔

بصائر و عبر کے سلسلہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکھی کی مثال میں اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا ہے کہ حضرت نبی کریمؐ کے مخالف خصوصاً اور انبیاء علیہم السلام کے منکرین و دشمن عموماً انکی ناوی کمزوری کے پیش نظر لاف گزاف مارتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ مکھی جو ایک نہایت ہی کمزور ہستی ہے وہ قوت اور طاقت جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے تم اور تمہارے معبودان باطل ملکر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے اسی طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم آج کمزور سمجھتے ہو اور اپنے بل بوتے پر اتراتے ہو۔ یاد رکھو اگر تم اپنی نظر میں ایک حقیر مکھی کیطرح بھی سمجھتے ہو تو

وہی تم پر غالب آئیگا تم اور تمہارے مصنوعی خدا اسکے مقابلہ میں شکست کھا جائیں گے۔

اسی لئے طالب اور مطلوب کے ضعف کا اعلان کر کے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْز

ماقدروا اللہ حق قدرہ کی حقیقت۔

ماقدروا اللہ حق قدرہٖ جو اس مقام پر مکھی کی مثال کے ضمن میں بیان ہوا ہے اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید (جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے) نے کیا تشریح کی ہے پارہ ۷ سورۃ الانعام رکوع ۱۱ کی پہلی آیت میں فرماتا ہے

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ط

حاصل مطلب یہ ہے کہ جب وحی الٰہی سے انکار کرنے والوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی وحی نازل نہیں کی تو انہوں نے اللہ کی قدرتوں اور صفات کا جو اندازہ حقیقی کرنا چاہئے تھا نہیں کیا۔

تنزیل وحی کا انکار ناقدر اللہ ہے۔

اس اور اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ منکرین وحی پر اتمام حجت کر رہا ہے اور تنزیل وحی کے متعلق دلایل پیش کئے ہیں یہ منکرین وحی دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو سرے سے انکار وحی کرتے تھے۔ جیسا کہ اس آیت میں ما انزل اللہ علی بشر سے ظاہر ہے اور ایک دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو نفس وحی الٰہی کی تنزیل کے تو منکر نہ تھے مگر وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تو وحی الٰہی کا نزول ہو چکا اور انکے سلسلہ کے بعد وحی الٰہی نعوذ باللہ منقطع ہو گئی۔ ان کے عقیدہ کے موافق یہاں علی بشر سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور قرآن کریم اپنے اعجاز کے لحاظ سے دونوں پر اتمام حجت کرتا ہے چنانچہ ان کے جواب میں تو کہدیا کہ

"ان سے پوچھو کہ موسیٰ علیہ السلام جو کتاب لائے تھے وہ کس نے اتاری تھی"

یہ گویا حجت الزمہ ان پر ہے جو نفس تنزیل وحی کے تو منکر نہ تھے مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر تنزیل وحی کا انکار کرتے تھے۔ اور دوسرے منکرین تنزیل وحی کا جواب آیۃ ۹۴ میں دیا۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَیُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ٥

ترجمہ:- اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے مبارک ہے اور مصدق ہے ان تمام صداقتوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور ان علوم کی بھی مصدق ہے جو آئندہ ظاہر ہوں اس کے نزول کی یہ غرض ہے کہ تو اُم القریٰ اور اس کے ارد گرد رہنے والوں کو ڈراوے اور جو لوگ یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہی اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور وہی اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اس آیت میں قرآن مجید کو الکتب کے نام سے پیش کر کے اس کے صفات میں بتایا ہے کہ وہ مبارک ہے۔ اسکی تعلیمات پر عمل کرنے والے برکات الٰہیہ سے حصہ لیں گے اور قرآن کریم کی صداقت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ ہر صداقت کی تصدیق کرتا ہے جو صداقت قرآن کریم کے نزول سے پیشتر آئی ہو یا بعد میں علوم صحیحہ کے ذریعہ ظاہر ہو۔ سابقہ صداقتوں سے مراد وہ تعلیمات ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعہ دنیا میں آئی ہیں اور وہ تمام علوم حقہ بھی ہیں جو ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔ جب بھی سائنس اپنے اکتشافات جدیدہ ثابت کریگی قرآن کریم کی تعلیم ان علوم حقہ کی مصدق ہوگی۔ اور یہ اب ثابت ہو رہا ہے کہ کوئی ایسا علمی اکتشاف نہیں ہوتا۔ جو قرآن مجید سے ثابت نہ ہو اور مصدق کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ کتب سابقہ میں جو بشارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے متعلق بیان ہوئی تھیں قرآن مجید

کے نزول اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت نے

انکے سچا ہونیکی تصدیق کر دی

تنزیل ربانی کے کام

اس آیت میں ایک مسکت جواب ان منکرین وحی کو دیا ہے جو نفس وحی کے بالکل منکر ہوتے ہیں اور اسکی صداقت کا ایک معیار بیان کیا اس کی تائید اسی سورۃ انعام کے ایک اور مقام پر آتی ہے

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

ترجمہ اور یہی وہ کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے۔ وہ مبارک ہے اسکی اتباع کرو۔ اور اسکے انکار سے بچکر یعنی التقویٰ اختیار کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر رحم کیا جاوے

یہاں برکات الٰہیہ کے حصول کا ذریعہ اور اس کے ثمرات کو بتایا ہے۔ حصول کا ذریعہ اتباع قرآنی ہے اور اس کے انکار سے بچنا ہے اور اس کی تعلیمات کو اپنا سپر بنا لینا ہے۔ اور نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ ایسا مومن باقرآن اور عامل باقرآن خدا تعالےٰ کی رحمت کا مورد ہوگا۔

اس بیان سے حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ تنزیل وحی کا انکار ماقدر اللہ حق قدرہ میں داخل ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ جو شخص خواہ وہ نفس وحی الٰہی کی تنزیل کا منکر نہ ہو اور وہ یہ خیال کرے کہ اب اللہ تعالےٰ کسی سے کلام نہیں کرتا وہ اس کا مصداق ہے کہ اس نے قدر اللہ کو نہیں سمجھا۔

اللہ تعالیٰ کا متکلم ہونا اسکی صفات میں سے ایک صفت ہے جو شخص

اس کا انکار کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی صفات و اعمال کی حقیقت سے قطعاً ناوا
محض ہے اس لئے وہ اس مقام معرفت کو کیسے پا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ
ایسے لوگ طہارت نفس اور تصفیہ قلب کی حقیقتوں سے محروم ہو جاتے ہیں

ایک اور تائید کی شہادت

اس حقیقت کی وضاحت قرآن کریم ایک دوسرے مقام پر اس طرح پر فرماتا ہے پارہ ۲۴ سورۃ الزمر رکوع ۸ آیۃ ۶۷

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ ط

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرمائی کہ جاہلو! تم مجھے کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی عبادت کروں بحالیکہ مجھ پر اور مجھ سے پہلے یہ وحی ہوئی ہے کہ اگر تو شرک کرے تو تیرا عمل یقیناً برباد ہو جائے گا اور تو ان لوگوں میں سے ہو جائیگا جو خسارہ پانے والے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کر اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جا۔

اس کے بعد فرماتا ہے مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ
اور اللہ تعالیٰ قدرت وقوت کی صفات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون وہ پاک ہے اور اسکی شان بلند ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں

ان آیات کو یک جائی نظر سے دیکھنے پر یہ حقیقت پورے طور پر کھل جاتی ہے کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ سے کیا مراد ہے۔

قدر اللہ کا مفہوم

قدر۔ تقدیر۔ اور قادر ایک ہی مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں قادر (ہو القادر) ایک صفت ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے تمام اشیاء کو ایک خاص مقصد

اور خاص اندازے پر کیا ہے اور اقتضائے حکمت کے موافق قویٰ عطا فرمائے ہیں۔

مسئلہ تقدیر اگرچہ اس سلسلہ بیان میں مسئلہ تقدیر بظاہر بے محل معلوم ہو مگر حقیقت میں ما قدر اللہ حق قدرہٖ کے اسرار معرفت میں سے وہ ایک اہم چیز ہے اس لئے کہ لفظ قدر اسی طرف اشارہ کرتا ہے اور قرآن مجید کے ان مقامات میں جن کا اوپر ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت و قوت کو بیان کیا ہے اور مسئلہ تقدیر کو صحیح معنوں میں نہ سمجھنا بھی، اس میں داخل ہے ما قدر اللہ حق قدرہٖ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا (سورۃ الفرقان پارہ ۱۸ آیۃ ۲) اصل قرآن میں دیکھو میں یہاں ترجمہ دیتا ہوں۔)

"وہ ذات بابرکات ہے جسکے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت ہے اور اسنے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ کوئی اسکی حکومت میں شریک ہے اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس چیز کی تقدیر بنائی"

ایک عام غلط فہمی عام طور پر تقدیر کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعمال کو پہلے سے مقدر کر دیا ہے کہ وہ نیکی کرے گا یا بداعمال ہوگا۔ اور انسان اس تقدیر میں محبوس ہے۔ یہ عقیدہ اور نظریہ غلط ہے قرآن مجید میں تقدیر کا لفظ مخصوص انسان کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ جہاں اس کا ذکر کیا ہے وہ تمام اشیاء کو شامل کیا ہے جیسا کہ اسی آیت میں ہے کہ ہر چیز کو پیدا کیا اور اسکی تقدیر

بنائی۔ پس یہ عام غلط فہمی ہے اور یہی ماقدروا اللہ میں داخل ہے اللہ تعالیٰ کی قدر کما حقہ نہیں کی۔

تقدیر کیا ہے؟

تقدیر اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے دو ہی معانی پر مشتمل ہے اس کے تیسرے معنے ثابت نہیں۔ اول قدرت کا عطا کرنا۔ دوم انکو اقتضائے حکمت کے موافق خاص اندازے پر بنانا اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسکو مناسب قویٰ دیئے اور مختلف استعدادیں ترقی کیلئے عطا کیں اور قویٰ کے استعمال کی ہدایت دی اور صحیح اور بداستعمالی کے نتائج سے آگاہ کر دیا۔ یہی تقدیر ہے۔

تقدیر کلیۃ العلوم ہے

تقدیر کا علم تو دراصل ام العلوم ہے بلکہ کلیۃ العلوم ہے جسقدر ایجادات اور انکشافات آج ہو رہے ہیں وہ علم علی التقدیر کا نتیجہ ہیں جب ہم خواص الاشیاء کو معلوم کرتے ہیں۔ اور انکی باہمی ترکیب یا تحلیل کے اندازوں پر بصیرت رکھ کر اپنے لباریٹری میں کام کرتے ہیں تو اس کے نتائج سامنے آجاتے ہیں اور اگر ان اندازوں کو (جنہیں میں قرآن کریم کی اصطلاح میں تقدیر کہتا ہوں۔) مدنظر نہ رکھا جاوے تو نتائج حسب مراد نہ ہوں گے یہی **فلسفہ مکافات عمل** ہے یہ تقدیر اشیاء سائنس کی زبان میں خواص الاشیاء ہے۔ اس مختصر بیان کے بعد میں پھر اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ **ما قدروا اللہ حق قدرہٖ** کے مفہوم میں مسئلہ تقدیر کا غلط مفہوم بھی داخل ہے۔ اگر مسلمان اس غلط مفہوم کو نہ لیتے تو وہ اسی قسم کی ترقیات کے مالک ہوتے جو ان کے اسلاف نے حقیقت تقدیر سمجھکر کیں۔

مغربی قوموں نے اس حقیقت کو سمجھا اور وہ نادانستہ طور پر ایک محجوب کی طرح قدر اللہ کے صحیح عمل پر اس حد تک کامیاب ہیں جو مادیات سے متعلق ہے الغرض اللہ تعالے کے اسم القادر کی تجلیات اور حقایق سے جو شخص غافل ہے وہ حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کرتا۔

ایک اور تشریح

ما قدروا اللہ حق قدرہٖ کی ایک اور تفسیر بھی میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم حاصل نکرنا اور بغیر علم صحیح کے اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں بحث کرنا بھی اس میں داخل ہے قرآن کریم نے اس کا نام جدال بغیر علم رکھا ہے چنانچہ فرماتا ہے سورۃ الحج رکوع اول آیۃ ۱

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ

اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالے کے بارے میں "جھگڑتے" ہیں اور انکے پاس کوئی علم نہیں اور وہ ہر سرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں۔

جدال فی اللہ

اس جگہ جدال فی اللہ ایک عام فعل کا ذکر کیا ہے اور یہ اس سے مراد نہیں کہ ایک عالم کو جدال فی اللہ جایز ہے بلکہ اسمیں اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہر شیطانی فعل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ اسی جدال کا نتیجہ ہوتا ہے اسی رکوع میں آگے چل کر آیت نمبر ۸ میں فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۱

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ ان کے پاس علم ہے نہ ہدایت اور نہ ان کے پاس ایسی کتاب ہے جو انکو روشنی دے یعنے انکو ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔

یہ جدال فی اللہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اسکی توحید اور اسکی صفات کے متعلق ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اس جدال فی اللہ کے مقابلہ میں حکم دیا۔ سورۃ الاعراف پارہ ۹ ع رکوع ۲۲ آیۃ ۱۷۹) وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہی حسن و خوبی کے اسماء ہیں او نہیں ناموں سے اسے پکارو اور جو لوگ اس کے اسماء حسنیٰ میں الحاد کرتے ہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے صفات منسوب کرتے ہیں جو حسن کیخلاف ہیں) تو انہیں انکے حال پر چھوڑ دو وہ اپنے کئے کا بدلہ پائینگے

الحاد فی اسماء اور صفات سے الٰہیہ کا تصور قرآنی

قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق جو تصور پیش کیا وہ الہ العالمین اور الہ واحد کا تصور ہے اور صفات الٰہیہ کے متعلق جو تصور پیش کیا وہ سراسر حسن کمال کا تصور ہے اور اسی لئے فرمایا الحمد للہ رب العالمین اور اس آیۃ حسنیٰ کا لفظ صفات کے متعلق بیان کر کے بتا دیا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال کے انتہائی کمالات کو بیان کرتا ہے اور قرآن مجید نے مختلف مقامات پر انکا ذکر کیا ہے میں نے بفضلہ تعالیٰ اسماء الحسنیٰ ہی کے نام سے اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب لکھی ہے

نکتہ معرفت

یہاں اسماء الحسنیٰ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی جو ہدایت فرمائی تو اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانی کمال جو اس کے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب سے متعلق ہے وہ انہیں صفات کے رنگ میں رنگین ہونے اور ان صفات کے نقشاء کو پورا کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اور الحاد فی اسماءہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو اپنے اعمال میں مدنظر نہ رکھنا ایک قسم کا الحاد ہے اور یاد رکھو ہر غلط عقیدہ اور ہر معصیت کا فعل اسی الحاد کا نتیجہ ہے یہ آیت جدال فی اسماءہ کے مسئلہ کو بھی واضح کرتی ہے۔ اور پھر قرآن کریم کے اس تصور کا ذکر کیا ہے جو قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق پیش کرتا ہے۔ اسکے لئے قرآن مجید کی اس آیۃ پر غور کرو سورۃ طٰہٰ پارہ ۱۶ آیۃ ۸ رکوع اول

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۝

غرض یہ ہے حقیقت اقدر اللہ حق قدرہ کی۔

اب میں اس مثال کے متعلق ضروری پہلوؤں کو بیان کر چکا اور قارئین کرام کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اس پر غور کریں اس امثال میں اللہ تعالیٰ ان علوم کی طرف توجہ دلاتا ہے جو ان امثال میں بیان کردہ مخلوق سے متعلق ہیں۔ مکھی کی اس قوت اور اس کے مقصد حیات کے سلسلہ میں جب انسان غور کرے گا تو ایک نیا علم اسے ملے گا اور وہ ہر پہلو سے مفید انسان ہوگا۔

(۳) عبدِ مملوک اور مالکِ مقتدر کی مثال

(۳) عبد مملوک اور مالک مقتدر کی مثال

قرآن مجید پارہ ۱۴ سورۃ النحل رکوع ۱۰ آیۃ ۷۶ میں ایک عبد مملوک کی مثال
بیان فرماتا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی
شَیْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰہُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَھُوَ یُنْفِقُ مِنْہُ سِرًّا وَّ
جَھْرًا ؕ ھَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ؕ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

اس رکوع کی خصوصیات

سورۃ النحل کے اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کئی مثالیں بیان کی ہیں اور انسانی زندگی کے بعض اہم مسائل پر بحث کی ہے۔

اولاً اس رکوع میں سامان معیشت میں بعض کو بعض پر فضلیت کا ذکر کیا ہے مگر اس کا یہ مقصد نہیں کہ یہ امتیاز بغیر کسی استحقاق اور محنت کے ہے۔ قرآن مجید نے یہ اصل متعدد مرتبہ بیان کیا ہے کہ انسان جس قدر اور جس قسم کی سعی کرتا ہے اسکی مکافات پاتا ہے۔ چونکہ انسانی عقل و فہم اور جسمانی استعدادوں میں فرق ہے۔ اسی کے لحاظ سے بعض کو معیشت میں بھی فضیلت حاصل ہے باایں قرآن کریم یہ اجازت نہیں دیتا کہ اس مالی یا معاشی برتری کے اسباب و ذرائع سے تم تنہا فائیدہ اٹھاؤ۔ اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے میں نے کتاب الزکوۃ میں اشتراکیت کے موضوع پہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ایک بنیادی اصل

قرآن کریم نے مساوات انسانی کو بطور ایک بنیادی اصل کے بیان کیا ہے اور مختلف طریقوں سے اس حقیقت کو آشکار

کیا ہے۔ خلقکم من نفس واحدۃ میں بھی اسی اصل کو بیان کیا ہے۔

اگرچہ نوع انسانی مختلف افراد و قبایل پر مشتمل ہے باوجود اس اختلاف کے وہ ان سب کو متحد الاصل قرار دیتا ہے اور اس کو نسل انسانی کے اتحاد کے طور پر بیان کیا تاکہ باہم تعاون ہو اور ایک دوسرے کے شریک درد ہوں یہ قرآن مجید ہی کا امتیاز ہے۔

غرض اس رکوع کا آغاز تو اس حقیقت کے بیان سے کیا کہ باعتبار رزق اگرچہ بعض کو بعض پر فضیلت ہے اور مسئلہ فضیلت کا انحصار مساعی کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف اتحاد فی الاصل کے خلاف نہیں اور جہاں وہ اکتساب معیشت میں آزادی دیتا ہے وہاں انفاق مال کی پابندی اس پر عاید کرتا ہے یہ بڑی لذیذ علمی بحث ہے میں صرف اس قدر کہکر ہی آگے چلتا ہوں کہ قرآن کریم ڈھیروں ڈھیر کما لانے سے منع نہیں کرتا۔ لیکن اسے انفاق کے زنجیر سے وابستہ کرتا ہے اور وہ اس اکتساب مال کو جایز نہیں قرار دیتا جو انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ پاک نہ کیا جاوے۔

اسی سلسلہ میں انسان کی اس نااہلی اور کمزوری کا ذکر کیا کہ وہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ وافر پاتے ہیں پھر بھی ایسے معبودان باطلہ کی عبادت کرتے ہیں جو زمین و آسمان میں ان کے لئے کسی رزق کا اختیار نہیں رکھتے اور انہیں کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ان امور کی صراحت کے بعد فرمایا کہ

لا تضربوا للہ الامثال (آیۃ ۷۴)

اس میں یہ سبق دیا ہے کہ اللہ کا تصور اپنے نقطۂ خیال یا اندازہ سے نہ کرو۔ انسان اللہ تعالیٰ کے تصور کے لئے مختلف قسم کی تماثیل تیار کرتا ہے۔ اسی میں اس بت پرستی کی طرف اشارہ ہے جو مختلف صورتوں میں کی جاتی ہے۔ اور اسی میں ان تصورات کا ابطال ہے جو انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق گھڑتا ہے اور اس کے لئے دوسرے مقام پر یہ کہکر وضاحت کی

لیس کمثلہ شئی

صفات الٰہیہ کے بنیادی مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد اس مثال کا ذکر فرمایا جسکی تصریح کے لئے اس قدر تمہیدی بیان میں نے لکھا ہے اور یہ ایک مثال نہیں بلکہ دو جدا جدا مثالیں ہیں ان میں سے پہلی مثال عبد مملوک کی ہے

عبد مملوک سے کیا مراد ہے

اس مثال میں بتایا کہ دو شخص ہیں انہیں سے ایک غلام ہے گویا خود اپنے قیام بقا میں دوسرے کا محتاج ہے اور کسی قسم کا اختیار اور تصرف اسے حاصل نہیں۔ جو خود دوسروں کا محتاج ہے۔ اس سے بڑھ کر بے وقوف اور احمق کون ہوگا جو

اپنی حاجات اسکے پاس لے جاوے

اور اس کے مقابلہ میں ایک اور شخص ہے جس کو اعلیٰ درجہ کا رزق اللہ نے عطا فرمایا ہوا اور وہ اس کے انفاق و تصرف پر پورا اختیار و اقتدار رکھتا ہو۔ یہی نہیں کہ اختیار رکھتا ہو بلکہ سراً و جہراً خرچ کرتا ہو۔ اسکی عطا کا ہاتھ لمبا ہو۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ عام عقل انسانی کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ہرگز نہیں۔

بصائر وعبر

اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے مختلف حقایق کو جمع کر دیا ہے
اول ۔ رزق کے معاملہ میں انسان ٹھوکر کھاتا ہے اور اس یا اُس کو رزاق سمجھ کر شرک کرتا ہے فرمایا کہ زمین و آسمان کی کائنات اور تمام سامانِ معیشت و رزق تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ کائنات کا ہر فرد اور ہر شئے وہ ذی روح ہو یا غیر ذی روح محتاج اور بے بس ہے پھر تم اتنا نہیں سوچتے کہ انہیں معبود بناتے ہو گویا شرک سے نفرت کا سبق دیا ہے آیت ۳، میں بھی وضاحت کی تھی یہاں مثال کے ذریعہ اس حقیقت کو آشکار فرمایا۔

دوم ۔ اس مثال میں (جو مکی سورت میں واقع ہوئی ہے) کفارِ مکہ کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام اور کام کی طرف توجہ دلائی ہے کفارِ مکہ کو بتایا کہ ایک تم ہو جو جھوٹے معبودوں کے پرستار ہو جن کے قبضہ قدرت میں کچھ نہیں اور خود تمہاری یہ حالت ہے کہ تم اپنے ہوائے نفس، کے غلام اور ہر قسم کی خوبیوں سے محروم ہو۔ دوسری طرف حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے۔ جو ہر قسم کے حسنات سے متصف اور نہ صرف وہ حسنات اور صفات سے آپ بہرہ اندوز ہے بلکہ دوسرے بھی اس سے متمتع ہوتے ہیں۔ تمہاری اس سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

رزقاً حسنا

رزقاً حسناً سے یہاں وحی الٰہی مراد ہے جس کی عملی صورت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عملی زندگی ہے۔ چنانچہ فرمایا

ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا تمہارے لئے ہر خوبی کو پیدا کریگا۔ اور اس اتباع میں مفاد یہی مضاد ہے جیسا کہ لکھ ہیں (ل) نافع ہے۔ اور خود قرآن کریم کو احسن الحدیث کہا گیا ہے جس پر تفصیلی بحث میں اسمائے القرآن میں کر چکا ہوں۔

غرض حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام رفیع کا اظہار اس آیت میں کیا گیا کہ

(۱) آپکو رزق حسن دیا گیا ہے یعنی وہ تعلیم جو قرآن کریم کی وحی میں دیگئی ہے جسکی طرف وہ نسل انسانی کو دعوت دیتا ہے۔

(۲) اس تعلیم کے کمالات وہ اپنی عملی زندگی سے ذہن نشین کرتا ہے اور اتباع کرنے والوں کا تزکیہ نفس کرتا ہے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ پیلی دہناری خدمات کو بجا لاتا ہے۔ جو سرًا اور علانیہ کا رنگ رکھتی ہیں۔ جہاں آپ کا دن دعوت الی اللہ میں گذرتا اور لوگوں کی ہر قسم کی ظاہری امداد میں بسر ہوتا آپکی رات ان دعاؤں میں گذرتی جو مخلوق کی اصلاح کے لئے اپنے مولیٰ کے حضور کرتے اس مثال عبد مملوک میں

اللہ تعالےٰ نے جہاں ردِ شرک کی حقیقت کو سمجھایا وہاں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام رفیع کا اظہار فرمایا

دو آدمیوں کی مثال

اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کی مثال پیش کرتا ہے

چنانچہ فرماتا ہے۔ سورۃ النحل یہی رکوع اس کے آگے کی آیۃ ۶،

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

اور دیکھو اللہ تعالیٰ ایک اور مثال دو آدمیوں کی بیان کرتا ہے ایک تو گونگا ہے اسے کسی بات کے کرنے کی قدرت ہی نہیں وہ تو اپنے مالک پر (ایک طرح) بوجھ ہی ہے جہاں بھی اسے مالک بھیجے۔ اس سے کوئی خوبی کی بات نہیں ہوتی اب بتاؤ) کیا گونگا شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ (برای حکم نہیں دیتا بلکہ) اپنی ذات (عملی زندگی) میں صراط مستقیم پر ہے۔

تشریحی نوٹ

قرآن کریم کا یہ بھی ایک اسلوب بیان ہے کہ وہ تدریجاً ایک امر کی وضاحت فرماتا ہے پہلی مثال میں بھی کمزور ایمان اور منکرین رسالت اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام میں امتیاز بیان کیا یہاں اسے اور واضح کیا۔

اس مثال کا پس منظر

اس مثال میں بھی ایک ایسی دلیل بیان کی ہے۔ جو انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ پہلی مثال تو ایک ایسے شخص کی تھی کہ جس میں کچھ قابلیت تو تھی مگر محکومی اور غلامی کی وجہ سے) وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس مثال میں تو گونگا شخص ہے۔ جو قوت کلام ہی سے محروم ہے اور اس کے مقابلہ میں وہ شخص ہے جو

ایک ایسے مقام پر ہے کہ لوگوں پر احکام نافذ کر سکتا ہے۔ ......
...... اور وہ اپنے احکام میں عدل کا حکم دیتا ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں شخص کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

ان مثالوں میں اور خصوصاً اس دوسری مثال میں نہایت ہی لطیف پیرایہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کے عمل کی شان کو نمایاں کیا ہے۔ ابکم کے مقابلہ میں رجل عظیم کو پیش کیا ہے۔ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ہیں۔ آپ ہی نے دنیا کو یہ تعلیم دی اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (الآیۃ) اور آپ ہی کے ذریعہ یہ ارشاد الٰہی نازل ہوا۔ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ اور آپ ہی کے منہ سے کہلوایا۔ (سورۃ انعام آیۃ ۱۶۲) قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ کہہ دو یقیناً مجھے میرے رب نے صراط مستقیم کی رہنمائی کی ہے۔ پھر اسی سورۃ انعام آیۃ ۱۵۳ میں فرمایا وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

یعنی یہ میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) ہے۔ پس تم اسی راستہ پر چلو اور دوسرے راستہ پر نہ چلو کہ وہ تم کو اس صراط مستقیم سے الگ کر دیں گے اسی کا تم کو حکم دیتا ہے اور اسی راستہ پر تم چل کر متقی ہو جاؤ گے اور دکھوں سے نجات پا جاؤ گے۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو مختلف طریقوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع اور مقام اقتدار کا ذکر کیا ہے۔ مجھے یہاں صرف اتنا ہی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مثال میں رجل کے لفظ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف اشارہ ہے چنانچہ سورہ یونس کی دوسری آیۃ ہی میں فرمایا اکان للناس عجبا ان اوحینا الی رجل منھم (الایۃ) کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ہم نے انہی میں کے ایک آدمی پر وحی کی (اس امر کی) کہ لوگوں کو انکی بدعملیوں کے برے نتائج سے متنبہ کر دو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ اس مثال میں جیسا کہ ہم نے بیان کیا حضور علیہ الصلوۃ والسلام ہی کو پیش کیا ہے مگر بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یامر بالعدل کے اظہار سے پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مراد ہے اور ابکم سے وہ بت اور معبودان باطلہ مراد ہیں جن کے متعلق آتا ہے (سورۃ الانبیاء پارہ ۱۷ آیۃ ۶۵)

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰؤُلَاءِ يَنْطِقُوْنَ ٥

اور تو تو جانتا ہی ہے کہ یہ بت بولتے نہیں۔ ان آیات سے استشہاد کر کے وہ کہتے ہیں کہ یہاں مراد اللہ تعالیٰ اور بت ہیں۔

یہ صحیح نہیں اس لئے کہ اسی سورۃ میں بلکہ اسی رکوع کی آیۃ ۷۴ میں فرمایا اللہ تعالےٰ کے لئے مثالیں نہ بناؤ۔ اور پھر فرمایا لیس کمثلہ شیء۔ پس یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقابلہ میں کفار کی حالت ہی کو بیان فرمایا ہے اور قرآن کریم نے دوسرے مقامات پر انکو صم بکم عمی بیان بھی کیا ہے۔

غرض

ان دو آدمیوں کی مثال میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اظہار فرمایا اور آپکی تعلیم اور آپ کے اخلاقی اور عملی کمالات کو نمایاں کیا گیا ہے

وللہ الحمد

(۴) دو اور آدمیوں کی مِثال

(۴) دو آدمیوں کی مثال

قرآن کریم نے دو اور آدمیوں کی مثال سورہ کہف میں بیان فرمائی ہے جو رکوع ۵ میں وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ سے شروع ہوتی ہے اور اس رکوع کے آخر تک چلی گئی ہے۔ قارئین کرام سورۃ کہف کے اس رکوع کو سامنے رکھ کر پڑھ لیں میں یہاں ترجمہ دوں گا۔ اور اس کے متعلق ضروری تشریح کروں گا۔ (انجولہ تعالیٰ)

اور ان کے لئے دو آدمیوں کی مثال بیان کر جن میں سے ایک وہ تھا جس کیلئے ہم نے انگوروں کے دو باغ (تاکستان) بنائے ان کے گرداگرد کھجوریں لگا دیں اور ان کے درمیان زراعت لگائی (۳۳) یہ دونوں باغ اپنے پھل دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔ اور ان دونوں کے درمیان ہم نے نہر جاری کی تھی (۳۴) اور وہ ہر قسم کے مال و متاع رکھتا تھا۔ اس (باغ کے مالک) نے اپنے ساتھی سے کہا جبکہ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بہ حیثیت مالی تم سے بڑھ کر ہوں اور جتھے کے لحاظ سے بھی غالب ہوں (۳۵) وہ اپنے باغ میں داخل ہوا۔ وہ، (اپنے طرز عمل سے) اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا کہنے لگا کہ مجھے وہم بھی نہیں آتا کہ یہ کبھی برباد ہو گا۔ (۳۶) اور میں یقین بھی نہیں کرتا کہ وہ انقلابی گھڑی (الساعۃ) آئے گی۔ اور اگر اپنے رب کی طرف لوٹا یا جاؤں تو اس سے بہتر مقام پاؤں گا۔ (۳۷) اس کے جواب میں، اس کے رفیق نے اس سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کیا تو اس (خالق) کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے

پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر تجھے پورا انسان بنا دیا (۳۸) لیکن میں یقین رکھتا
ہوں وہ میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔
(۳۹) اور تجھے چاہیے تھا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تھا کہتا اللہ تو
جو چاہتا ہے (وہی ہوتا ہے) اللہ تعالیٰ ہی سراسر قوت ہے اور اس کے
سوا کوئی قوت نہیں اور اگر تو اپنے مال و اولاد کے زعم میں مجھے اپنے سے
حقیر سمجھتا ہے۔ (۳۹) (تو یاد رکھ) مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے تیرے
باغ سے بہتر باغ عطا فرمائے گا اور (تیرے باغ پر آسمان سے بلا نازل کرے
اور اسے چٹیل میدان کر دے (۴۰) اور یا اس کا پانی نیچے چلا جاوے۔
پھر تو اسے نکال نہ سکے (۴۱) نتیجہ یہ کہ اس کا مال و متاع تباہ کر دیا گیا
اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا .... اس نقصان پر جو خرچ
ہوا تھا۔ اور وہ ویران تھا۔ اور اس کی چھتیں گری ہوئی تھیں۔ اور کہتا
رہا۔ کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا (۴۲) اور اس کے لئے
کوئی جماعت نہ رہی جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکے اور وہ
خود بھی اس قابل نہ رہا کہ بدلہ طلب کر سکے (۴۳) اسی مقام پر ولایت اللہ
کے لئے ہے جو حق ہے وہی بدلہ دینے میں اچھا ہے۔ اور بہترین انجام
لانے والا ہے (۴۴)

تشریحی نوٹ

دراصل اس اور سورۃ کہف میں بعض اور مثالوں کے
سمجھنے کے لئے سورۃ کہف کے مطالب و مقاصد پر غور کرنے
کی ضرورت ہے اس سورۃ میں عیسائی مذہب کی ابتدائی حالت اور اس کی

ترقی اور بالآخر عیسائی اقوام کی ہلاکت وتباہی اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی ابتدائی حالت اور بالآخر اس کی کامیابی کی عظیم الشان پیشن گوئیاں ہیں۔ اور غور وفکر کرنے والے لوگ ان حقایق سے، قرآن مجید۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور توحید الہٰی کے زبردست ثبوت کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

۲۴ برس پیشتر ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں سورہ کہف کی تفسیر میں نے شایع کی تھی۔ اس میں بھی تفصیل سے بحث کی تھی۔

اس مثال میں عیسویت اور اسلام کو یا حق و باطل اور مومن ومسلم کی مثال دو آدمیوں کے رنگ میں پیش کیگئی ہے اور یہ مسلمہ امر ہے کہ مثال عموماً تعلیمی حقیقت کی مظہر ہوتی ہے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بطور ایک واقعہ کے بھی ہو۔ لیکن یہاں، مثال کے پیچھے ایک حقیقت کو بیان کیا ہے۔

پہلا شخص جس کو ہر قسم کے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ان انعامات پر اس قدر مغرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی قدرتوں پر ایمان تو درکنار اس کا ذکر تک اس کی زبان پر نہیں آتا۔ اور وہ اس میں ایسا محو اور مست ہے کہ اپنے دوسرے بھائی کو جس سے ہمکلام ہے اپنی قوت و دولت کا اظہار کر کے اس کی حقارت کرتا ہے عیسائی اقوام نے اپنی ترقیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس کے بالمقابل میں اسلام یہ روح پیدا نہیں کرتا۔ چنانچہ اس مثال

کا دوسرا مرد مومن اولاً اسے نصیحت کرتا ہے کہ ان انعامات پر تمہارا عمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ تم اپنے خالق و مالک اور رب کا شکر کرتے۔ اس کی حمد کرتے اور اس کی قدرتوں پر ایمان لاتے۔ مگر میں تمہارے اس طریق کو اختیار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہی میرا رب ہے۔ میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ رہا یہ امر کہ تو اپنے اس مال و متاع اور کثرت اولاد کی وجہ سے بے حقیر سمجھتا ہے تو یاد رکھ کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ میرا رب **تیرے ان باغات سے بہتر باغات عطا کرے گا** ۔ یہ ایک پیش گوئی ہے۔ باغات سے مراد باغات ہی نہیں ہوا کرتے بلکہ روحانی علوم میں باغات ہر قسم کے انعامات پر حاوی ہوتے ہیں کثرت اموال۔ کثرت اولاد حکومت گویا جو بہترین سامان آسائش و احترام ہیں وہ حاصل ہو جائیں۔

غور کرو یہ آیات مکّہ میں نازل ہو رہی ہیں جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپکی جماعت سخت مشکلات میں مبتلا اور ہر طرح سے ہدف حقارت بنی ہوئی تھی۔

مگر اس مثال میں اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایقان اور اللہ تعالیٰ پر امید کامل کے عالی مقام کا اظہار فرمایا اور دنیا نے دیکھا کہ

آپ کو وہ سب کچھ دیا گیا

جس کی طرف اس مثال میں اشارہ تھا۔ غرض یہ مثال عیسویت اور اسلام کی تاریخ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے عیسویت پر بھی ابتدائی ایام میں مشکلات آئے اور یہ اس وقت آئے جب خدائے وحید کے پرستار تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی دعوت کے ساتھ یہی سنت اللہ ہے۔ لیکن پھر اس نے ترقی کی کہ وہ ایک شاہی مذہب ہو گیا مگر اس مقام توحید سے گر گیا اور اس کا مقصود دنیا ہو گئی۔ اور جیسا کہ اسی سورۃ کہف کے آخری رکوع میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی، کوششیں اور ہمتیں دنیوی مصنوعات میں غرق ہو گئیں۔ اور یہی ان کے لئے عذاب مقدر کا موجب ہوا۔

برخلاف اس کے اسلام بھی ابتدائی حالت میں مشکلات اور مصائب کا آماجگاہ رہا لیکن حقیقی روح اسلام ترقی کرتی رہی۔ اور اس کے ساتھ ہر قسم کی ترقیات کے سلسلے بھی بڑھتے گئے اور آج وہ، تمام دنیا میں موجود ہے۔

بصائر و عبر

اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے بیان میں مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ تم دنیا کی کامیابیوں پر متکبر نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ جو مٹی سے انسان کو ان استعدادوں اور کمالات کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔ کہ وہ خود ایک قسم کی تخلیق کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن نادان اللہ تعالیٰ کے دامن کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنی عقل و فکر (جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے) پر ناز کرتا ہے اور ایسے گھمنڈ

پر اللہ تعالیٰ کا زبردست ہاتھ

اسے فنا کر دیتا ہے

جیسا کہ باغ کی مثال میں بتایا۔

دوسرے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ کی، ربوبیت اور اس کی رحمت پر پُر امید رہو۔ تو اللہ تعالیٰ خود تمہارا ناصر ہو گا اور تم منصور ہو گے۔

اللّٰهُمَّ اجعلنا منهم

(۵) حیاتُ الدُّنیا کی مثال

(۵) حیات الدنیا کی مثال

اسی سورۃ کے ساتویں رکوع کے آغاز میں حیات الدنیا کی مثال
اس طرح پر بیان کی (سورہ کہف آیۃ ۴۵)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ٥ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ٥

(اے نبی!) ان کے لئے حیات الدنیا (دنیوی زندگی) کی مثال بیان کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور زمین کی روئیدگی اس پانی سے مل کر نمایاں ہو جاتی ہے۔ (پھر انجام کیا؟) سب کچھ چورا چورا ہو جاتا ہے اور ہوا کے جھونکے اسے اڑائے پھرتے ہیں (یہ نظارہ ثابت کرتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے (۴۵)

(سنو!) مال و دولت اور اولاد دنیوی زندگی کی دلفریبیاں ہیں (ان کو دوام نہیں) اور باقی رہنے والے تو اعمال نیک ہیں اور تیرے رب کے حضور ان کے لئے ہی بہترین بدلہ ہے۔ اور یہی وہ اعمال ہیں جن سے بہترین امید وابستہ ہے (۴۶)

تشریحی نوٹ :- ان ہر دو آیات میں حیات الدنیا کو ایک مثال

قدرت سے واضح کیا ہے اور اس سے پہلے مومن اور کافر کی زندگی کے منظر کو جس رنگ میں پیش کیا تھا اسی مثال کو ایک اور رنگ میں پیش کیا تاکہ انسان نہ صرف مقصد زندگی کی حقیقت کو سمجھ لے بلکہ فانی مناظر قدرت کو دیکھ کر فانی چیزوں سے دل وابستہ نہ ہو۔

حیات الدنیا اور حیات الآخرۃ میں امتیاز

حیات الدنیا کے مقابلہ میں حیات الآخرۃ کی امتیازی اور دائمی حقیقت کو نمایاں کیا ہے دراصل اس مثال کو پہلی مثال کی ایک دوسری صورت کہنا چاہئے۔

قرآن کریم کا یہ بھی ایک اسلوب بیان ہے کہ وہ وضاحت کے لئے ایک حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے اس مناظر قدرت میں دنیوی زندگی کی ابتدائی خوب صورتی اور دلکشی کا ذکر کیا۔ لیکن جیسے زمین سے پیدا ہونے والی روئیدگی اور سبزیات اولاً بڑی خوش نما اور نظر فریب، ہوتی ہیں اسی طرح دنیوی زندگی کے سازوسامان بڑے دلکش اور جاذب نظر ہوتے ہیں۔ مگر آخر کار وہ ایک دکھ اور حسرت کا سامان ہو جاتے ہیں

دنیوی زندگی کے سامان زینت

دنیوی زندگی کا سامان زینت خلاصۃً دو چیزوں میں بیان کیا ہے اسکی تصریحات قرآن کریم دوسرے مقام پر بھی بیان کرتا ہے جیسا کہ میں بتاؤں گا اس مقام پر اسے مال اور بنون (کثرت اولاد) سے تعبیر کیا ہے اور مال ہر قسم کی دلفریبیوں اور سامان تعیش کو پیدا کرتا ہے۔ اور کثرت اولاد کے ضمن میں اس طاقت اور قوت کا اظہار کیا جو کثرت نفوس سے ایک جماعت اور جتھے

کے طور پر پیدا ہوتی ہے لیکن یہ دونوں چیزیں انسانی پیدائش کا مقصد نہیں

پہلی مثال سے تعلق

اس سے پہلی مثال میں دو باغوں کے مالک نے یہی کہا کہ میں تجھ سے مال و دولت اور جتھے کے لحاظ سے افضل ہوں اور یہاں اس حقیقت کو حیاۃ الدنیا کی زینت سے تعبیر کیا ہے اور اس پہلی مثال میں مومن کی عملی زندگی کو بیان کیا اور بتایا کہ اللہ تعالی ہی بہترین بدلہ دینے والا اور بہترین انجام پیدا کرنے والا ہے۔

حیات الدنیا قرآن کریم میں

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر حیات الدنیا کی حقیقت بیان کی ہے میں ذیل میں چند مقامات کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

(۱) پارہ ۱۰ سورۃ التوبہ رکوع ۶ آیۃ ۳۸

أَرَضِيتُم بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝

کیا تم آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پر لٹو ہو گئے (یاد رکھو) آخرۃ کی زندگی کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کی حیثیت بہت ہی کم ہے۔

یہاں بتایا کہ دنیوی زندگی اور اس کے سامان راحت و آسائش کی آخرۃ کے انعامات و ثمرات کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں پہلے فانی اور دوسرے دائمی اور غیر فانی ہیں۔

(۲) سورۃ آل عمران پارہ ۳ رکوع ۲ آیۃ ۲۵ میں متاع الحیوۃ الدنیا کی تفصیل بیان کی ہے یہ گویا زینت الحیوۃ الدنیا کی حقیقت ہے اللہ تعالی فرماتا ہے

لوگوں کے لئے دنیوی زندگی کے مالوفات میں رغبت رکھی گئی ہے وہ مرغوب چیزیں کیا ہیں۔ عورتوں اور بیٹوں سے تعلقات محبت۔ چاندی اور سونے کے ذخیرے اور خوب پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور زمینداری مگر یاد رکھو کہ یہ سب کچھ اس دنیا کی زندگی کا سامان آرائش و آسایش ہے۔ (جو تمہاری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے) اللہ تو کے حضور ہی بہتر ٹھکانا ہے۔

اس میں بتایا کہ یہ اصلی دولت نہیں اور نہ یہ مالوف چیزیں، ابدی راحت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اصلی دولت ایمان و عمل ہے چنانچہ اس سے اگلی آیۃ میں فرمایا ہے کہ میں بتاؤں دنیا کی آسایش و آرائش کے سامان کے مقابلہ میں بہترین چیز کیا ہے۔ وہ ہے تقوی اللہ جس کے نتیجے میں نہ صرف وہ مسرتیں حاصل ہوتی ہیں جو تم مالوفات میں محسوس کرتے ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام ملتا ہے اور اس کے بعد ان اعمال صالحہ کا ذکر کیا جو اس نعمت عظمیٰ کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

(۳) سورۃ آل عمران آیۃ ۸۴ میں فرمایا

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

اور دنیا کی زندگی تو اس سے زیادہ نہیں کہ انسان مختلف خواہشوں اور تمناؤں کے گرداب میں مبتلا ہے۔ اس میں زندگی کے مقصد کو فوز کہا ہے اور محض انسانی خواہشات و شہوات کا گرویدہ رہنا تو مقصد زندگی نہیں جو اس کو مقصد سمجھتا ہے وہ گویا ایک فریب خوردہ شخص ہے اسلئے کہ یہ ابدی نہیں

(۴) سورۃ الانعام رکوع ۴ آیۃ ۳۲ میں حیات الدنیا کی ایک اور

حقیقت بیان کی چنانچہ فرمایا

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۗ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

اور دنیا کی زندگی صرف ایک کھیل اور بے حقیقت چیز ہے اور آخرۃ کا بہترین گھر تو متقیوں کے لئے ہے تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے۔

یہاں حیواۃ الدنیا کو لہو اور لعب قرار دیا لہو سے مراد ہر وہ شئے ہے جو انسان کو اس کے ضروری اور اہم فرایض منصبی سے، روک دے اور دوسری طرف مشغول کر دے اور لعب ایسے افعال کو کہتے ہیں جس سے کوئی صحیح مقصد پیدا نہ ہو۔

غرض قرآن کریم حیواۃ الدنیا سے مراد انسان کی سفلی خواہشات میں منہمک ہو جانا قرار دیا ہے۔ لیکن اگر انسان اصل مقصد کو فوت نہ ہونے دے اور ہر وقت اسے پیش نظر رکھے تو یہ مادی اور طبعی خواہشات بھی اطاعت اللہ اور تقوی اللہ کے تحت آکر اللہ تعالٰی کی رضا کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

غرض قرآن کریم نے حیات الدنیا اور حیات الآخرۃ کے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور اصل حیات الدنیا کو حیات الآخرۃ کے اعمال کے ماتحت کر کے وہ فوز حاصل کرنا مقصود ہے جو انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے۔

یہاں تک میں نے مضمون کی وضاحت کے لئے قرآن کریم کے

دوسرے مقامات سے حیواۃ الدنیا کی حقیقت بیان کی اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

حیات الدنیا اور حیات الآخرۃ کا تعلق۔!

اللہ تعالیٰ نے حیات الدنیا کی مثال میں بارش اور اس کے اثرات اور ثمرات کو پیش کیا اور سامان زینت میں مال اور بنون کو رکھا اور اس کو زینت الدنیا کہکر پھر معاً باقیات الصالحات کا ذکر کر دیا بظاہر یہ ایک بے ربط سی بات معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں اس کے نیچے زینت کا حقیقی فلسفہ رکھا گیا ہے کہ اگر مال اور اولاد کو اس رنگ میں استعمال کیا جاوے جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے تو یہ اعمال صالحہ کا ذریعہ ہو کر حیات ابدی اور اجر عظیم کا موجب ہو سکتے ہیں۔ مال کو فی سبیل اللہ خرچ کیا جاوے اور اولاد کی صحیح تربیت کر کے خدمت دین میں لگا دیا جاوے تو یہ حیات ابدی کا ذریعہ ہو جاتے ہیں نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آنے والی حیات میں بھی

غرض

اس مثال کو اس پہلی مثال سے تعلق ہے اور یہ گویا اسکی عملی تفسیر ہے اور اس میں یہ سبق اور ہدایت ہے کہ انسان اس فانی زندگی اور اس کے ساز و سامان کو صحیح طریقہ پر استعمال کر کے۔

ایک حیات ابدی حاصل کرسکتا ہے

(۶) طیّب اور خبیث کلمہ کی مثال

(۶) طیب اور خبیث کلمہ کی مثال

منجملہ ان امثال کے جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال دو درختوں سے دی ہے ایک شجرِ طیبہ اور دوسرا شجرہ خبیثہ۔ چنانچہ سورہ ابراہیم پارہ ۱۳ رکوع ۴ آیۃ ۲۵ سے ۲۷ تک

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُہَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُہَا فِی السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِیْٓ اُکُلَہَا کُلَّ حِیْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّہَا ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۝ وَمَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ ۣاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَہَا مِنْ قَرَارٍ ۝ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۙ۟ وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ۝

ترجمہ:۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ خدا تعالےٰ کس طرح کلام پاک کی مثال کھول کر بیان کرتا ہے۔ کلمہ طیبہ ایک پاک درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور اسکی ہر شاخ (آسمان کی بلندی) میں پہنچی ہوئی ہے۔ وہ ہر وقت اپنے رب کی اذن سے اپنا (تازہ) پھل دیتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ لوگوں کے لئے تمام باتیں بیان کرتا ہے تاوہ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۵)

اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی ہے جس کو زمین پر ہی سے، اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے (مضبوط جڑ نہیں رکھتا) اس کو کچھ بھی قرار نہیں (۲۶) (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ مومنوں کو مضبوط رہنے والی بات کے ذریعہ مضبوط (کامل الیقین) کرتا ہے اس دنیا میں بھی اور آخرۃ میں بھی اور ہلاک کر دیتا ہے ظالموں کو اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۲۷)

ترتیب و ربط آیات

قبل اس کے کہ میں اس مثال کی توضیح بیان کروں ایک ضروری نکتہ معرفت بیان کرنا چاہتا ہوں اور قرآن کریم کے فہم کے لئے اس کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم ایک منظم کلام ہے اس کی آیات میں باہم ایک ایسا ربط اور ترتیب ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس مثال کے بیان کرنے سے پہلے اللہ تعالےٰ نے ظالموں کے لئے عذاب الیم اور مومنین کے لئے فرمایا

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۝

اور وہ لوگ جو مومن ہوئے اور انہوں نے اس ایمان کے موافق اعمال صالحہ کئے جنت میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اپنے رب کے اذن سے انہیں باغات میں رہیں گے اور ان باغات میں انکی دعا ملاقات سلام ہو سلام ہو ہوگی

اس مکافات عمل صالحہ کے بیان کے بعد اس مثال کو بیان کیا ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ اس مثل کو نعمائے جنت اور اس کے

حصول کے اسباب کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ مخصوص نعمائے جنت سے ہے اس کے مضمون میں وسعت ہے اسلئے کہ اس کو تو شجر طیبہ کہا ہے اور اس کے شاخوں کا ذکر ہے گویا مثال متعدد معارف کی حامل ہے مگر میں نے قرآن کریم کی ترتیب و ربط کے لحاظ سے ایک پہلو کا ذکر کیا ہے۔

حصول جنت کا طریق

قرآن مجید نے حصول جنت کے طریق کو بیان کرتے ہوئے ایمان اور اعمال صالحہ کو ملازمی قرار دیا ہے اور اس کے ثمرات کو جنات (باغات) سے تشبیہہ دی ہے ایسے باغات جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں تاکہ وہ سدا بہار اور سرسبز اور شاداب رہیں ان انعامات کے حصول میں بھی باذن ربھم فرمایا۔ اور درخت طیب کی مثال میں اس کے دائمی ثمرات کے لئے باذن ربھا فرمایا۔ اس طرح یہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مثال کے ضمن میں ان حقائق کو جمع کر دیا ہے۔ جو ایمان اور اعمال صالحہ اور اس کے ثمرات کو لئے ہوئے ہیں۔ اس قدر تمہیدی نوٹ کے بعد اب میں ایک تشریحی نوٹ لکھتا ہوں تشریحی نوٹ اس مذکورہ آیت میں تمثیلی رنگ میں قرآن کریم کی ان زندگی بخش صفات کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

قرآن کریم شجرہ طیبہ ہے

اس میں قرآن کریم کو ایک شجرۂ طیبہ کی صورت میں پیش کیا ہے ایسا شجرہ طیبہ جس کی جڑیں مظبوطی سے قائم ہوں اور جسکی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی

اور بلند ہوں اور ہر وقت جو تازہ بتازہ پھل دے رہا ہو۔ گویا وہ،
سدابہار اور شاداب درخت ہے۔ اور اس میں پانچ قسم کی خوبیاں ہیں
(الف) طیّب پاک ہو اس کی ظاہری شکل وصورت بھی عمدہ ہو
کسی قسم کا نقص اور عیب اس میں نہ ہو اور اپنی باطنی خصوصیات اور
تاثیرات کے لئے بھی پاک ہو۔

(ب) اس کی جڑ مضبوط ہو، کسی قسم کی طوفانی ہوا اسکو جڑ سے نہ
ہلا سکے اور وہ ہر قسم کے حملوں سے محفوظ ہو۔

(ج) اس کی شاخیں بہت ہی بلند ہوں، گویا آسمان میں پھیل رہی ہیں

(د) وہ ہر وقت پھل دے رہا ہو یعنے اس کے ثمرات ہر زمانہ اور ہر
وقت تازہ بتازہ مل سکتے ہوں۔

(ہ) اور یہ عطائے ثمرات اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہو۔

قرآن کریم نے کلام سماوّی کا یہ ناقابلِ خطا معیار پیش کیا
ہے اور اس معیار پر قرآن کریم کے سوا کوئی مذہبی کتاب کامل
المعیار ثابت نہیں ہوتی۔

سب جہاں چھان چکے ساری کتابیں دیکھیں
مئے عرفاں کا یہی ایک ہی شیشہ نکلا!

ان صفات خمسہ کو زیر نظر رکھ کر جب قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو
اسمیں یہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں اول طیب، ہر قسم کے نقص اور عیب
سے پاک قرآن کریم کی ظاہری ترتیب اسکا اسلوب بیان دیکھو تو وہ اپنے

اندر خاص جذب اور کشش رکھتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کا ترجمہ بھی نہ جانتا ہو اور اُس کے مطالب سے آگاہ نہ ہو بلکہ وہ اس کو خدا کا کلام بھی نہ جانتا ہو جب قرآن مجید صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھا جاوے تو وہ

سننے والے کو مسحور کر دیتا ہے

حضرت مولوی عبدالکریم رضی اللہ عنہٗ جب قرآن مجید پڑھا کرتے تھے تو ان کے مکان کے نیچے گلی میں راہ چلتے مسافر ہندو ہوں یا سکھ یا کسی اور مذہب کے وہ کھڑے ہو جاتے اور بت بن کر سنتے رہتے اور اس کی لذت سے سیراب ہو جاتے۔ پاک چیز جو ہر قسم کے نقص سے مبرا اور اپنی تاثیرات میں بھی پاک جذبات پیدا کرتی ہو۔ یہ بھی قرآن مجید کی تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَیُزَکِّیْھِمْ کہ وہ پاک وصاف کرتا ہے اپنے متبعین کو اور دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ناقابل تردید صداقت ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُردوں کو زندہ کردیا

دشمنوں تک نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ قوم جو ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھی وہ دنیا میں اپنی نیکی اور پاکیزہ سیرتی میں نمونہ بن گئی۔ قرآن کریم کی تعلیم کو دیکھو کہ وہ انسان کی طبعی، اخلاقی اور روحانی حالتوں میں پاکیزگی کے اعلیٰ مقام پر لے جاتی ہے۔

دوسری خوبی جڑ کی مضبوطی ہے۔ علم نباتات کے ماہر جانتے ہیں کہ درخت کی جڑ ہی دراصل اس کی حیات اور نشوونما کا ذریعہ ہے

جس قدر کسی درخت کی جڑ مضبوط ہوگی اسیقدر وہ طبعی حوادث جھکڑ وغیرہ کے حملوں سے محفوظ رہے گا اور جڑ کے ذریعہ سے وہ اپنے نشو ونما کیلئے ان مادوں اور کھادوں کو جذب کرتا رہے گا جو زمین میں اجزائے حیات کی صورت میں موجود ہیں اور جڑ کی مضبوطی پانی کے ان اجزا کو بھی جذب کرتی رہے گی جو مایۂ حیات ہیں اور جس کے لئے قرآن شریف نے یہ صداقت پیش کی کہ ہم نے ہر چیز کے لئے پانی کو مایۂ حیات بنایا ہے۔ اسی طرح پر قرآن کریم اپنے اصولِ تعلیم میں نہایت مضبوط جڑ رکھتا ہے۔ کوئی حملہ اس کو اپنے مقام سے ہلا نہیں سکتا جب سے قرآن مجید نازل ہوا ہے نادان معترضین مختلف رنگوں میں اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں مگر وہ ہر اعتراض کا جواب دیتا ہے اور اپنی صداقت کا اقرار کرائے بغیر نہیں چھوڑتا اس زمانہ میں جب کہ سائنس اور علوم کے جدید انکشافات ہو رہے ہیں عصری علوم کے زیر نظر اعتراض کرنے والوں کی ایک نئی جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر قرآن کریم نے ثابت شدہ صداقتوں کی تصدیق کی اور غلط اور بے بنیاد اعتراضات یا تھیوریوں کی کمزوری اور غلطی کو آشکار کر دیا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اور آپکے جانشین اور مصلح موعود ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے خدا داد علم کی بنا پر

قرآن مجید کے مقابلہ میں ہر مخالف و معترض کو دعوت مبارزت دی مگر کسی کو مقابلہ میں نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔

تیسری خوبی:۔ تیسری خوبی جڑ کی مضبوطی کی یہ ہے کہ وہ نہ صرف حوادث

کا مقابلہ کر سکتی ہے بلکہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت عصری تبدیلیوں کے ماتحت بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن مجید کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ

باطل قرآن مجید میں کسی جہت سے بھی حملہ آور ہو کر کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ (وہی) شکست کھائے گا۔

چوتھی خوبی:۔ جڑ کی مضبوطی کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ وہ لمبی عمر پانے والا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی عمر تو اتنی لمبی ہے کہ اس پر کبھی فنا ہو ہی نہیں سکتی اس لئے کہ وہ الحیّ القیّوم خدا کا کلام ہے اور اللہ تعالےٰ نے اس کی حفاظت کا آپ ذمہ لیا ہے۔

فرعہا فی السماء

شجرہ طیبہ کی شاخوں کا بلند ہونا نہایت ضروری ہے جس قدر شاخیں بلند ہوں گی وہ کھلی ہوا میں سے آکسیجن حاصل کر کے اپنی پرورش اور نشوونما میں مدد لے گا۔ اور ان شاخوں کے پہنچنے میں بھی سہولت ہوگی۔ جڑ کی مضبوطی اور قوت اس کی شاخوں کے نشوونما میں سازگار ہوتی ہے اور کلام الٰہی کی جڑوں کو مضبوط کرنے والی عملی جماعت ہوتی ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر کلام الٰہی کی اشاعت عملی رنگ اختیار کرکے ہوگی جماعت کا دائرہ وسیع ہوگا۔ آسمان میں شاخوں کے پھیلنے سے کلام الٰہی کے ذریعہ روحانی ترقیات اور قرب الٰہی

کے حصول کی راہوں میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور آسمان میں جو چیز ہو وہ سا فیع الشان ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن مجید کے مدارج عالیہ کو بتا دینا مقصود ہے اور بلند مقام بھی ہر قسم کی آفات سے، محفوظ ہوتا ہے اس میں بھی قرآن کریم کی حفاظت کا اشارہ ہے۔

علاوہ بریں شاخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کثرت سے ہیں۔ قرآن کریم بھی اپنی تعلیم میں تمام انسانی ضروریات کے لئے ہدایات کا جامع ہے۔ انسان کی طبعی، اخلاقی، روحانی ضرورتیں اس کی زندگی کے مختلف مراحل کی ضروریات تمام وکمال ہدایات کو اپنے اندر رکھتی ہیں، قرآن مجید کے اوامر ونواہی کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جذبات کے باریک سے باریک شعبوں کے صحیح استعمال اور مضرات سے بچنے کی ہدایات موجود ہیں۔ نہ صرف فرد کے لئے بلکہ قوم اور ملت کی جو ضروریات پیدا ہوتی ہیں ان سب کے متعلق ہدایات اور اصولی تعلیم موجود ہے۔ بادشاہ کے لئے، رعایا کے لئے، مزدور کے لئے، سرمایہ دار کے لئے عدالت وامن کے، انتظامات قانون اور تعزیرات۔ غرض کوئی شعبہ انسانی فردی یا جماعتی زندگی کا ایسا نہیں کہ اس کے متعلق ضابطہ اور دستور العمل موجود نہ ہو جیسے شاخ کی کثرت سے انسانی ضروریات کے لئے مختلف کامل ہدایات کی طرف اشارہ کرنا مدنظر ہے۔ ویسے ہی شاخ کے آسمان میں ہونے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کلام الٰہی کی قوت عمل انسان کو اوپر کی طرف لے جاتی ہے۔ سفلی جذبات پر موت طاری کرکے

ان میں قرب الٰہی کے لئے حیات نو پیدا کرتی ہے۔ اور یہ بھی کہ آسمان بلندی کی طرف اشارہ کرتا ہے کامل کلام الٰہی میں یعنے قرآن مجید میں یہ خوبی ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم پر مشتمل ہے۔

شجرۂ طیبہ کی چوتھی علامت یہ ہے کہ وہ ہر وقت تازہ بتازہ پھل دیتا ہے۔ وہ سدا بہار ہو۔ اس پہلو سے قرآن کریم میں یہ کمال ہے کہ وہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتا رہتا ہے جو خدا تعالےٰ کی تائیدات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور ان کا وجود آیۃ اللہ اور حجۃ اللہ ہوتا ہے ان کے ذریعہ خدا تعالےٰ کی ہستی، خدا تعالےٰ کی صفات اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپؐ کے معجزات و آیات اور قرآن کریم کی صداقت و عظمت کا ثبوت اس طرح پر ملتا ہے

چوتھی علامت

کہ **قرآن کریم نے عملی زندگی** کے جو ثمرات بیان کئے ہیں۔ وہ ان کے وجود میں نمایاں ہوتے ہیں خدا تعالیٰ ان سے کلام کرتا ہے۔ (۱) قبل از وقت بعض آنے والے واقعات عظیم الشان کی انہیں اطلاع دیتا ہے۔ (۲) انکی کامیابی اور ان کے مقابلہ میں کھڑے ہونے والوں کی ناکامی کا ایسے وقت میں علم بخشتا ہے جب کہ دنیا کا کوئی مدبر اور فریسی اس قسم کی پیشگوئی نہیں کر سکتا۔ (۳) ان میں خارق عادت استقلال اور عزم عنایت کرتا ہے۔ (۴) ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے (۵) ان کو ایک **قوتِ قیادت عطا فرماتا ہے** یعنے وہ ایک جماعت قائم کرتے ہیں جو ان کے جذب و کشش کا ثبوت ہوتی ہے۔ اور پھر

وہ اپنی قوت قدسی کے ذریعہ اس جماعت کی عملی زندگی میں انقلابی تاثر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جماعت کے افراد کے دلوں میں غیر اللہ کا خوف اور غیر اللہ کی احتیاج مٹا دیتے ہیں اور خدا تعالےٰ کی راہ میں ہر قسم کی قربانی کی قوت پیدا کر دیتے ہیں۔ گناہ سے نفرت اور نیکی اور طہارت سے محبت ان میں پیدا کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ غرباء کی جماعت سے آغاز کرتے ہیں اور پھر اسی جماعت کو حکومتوں اور سلطنتوں کا وارث بنا دیتے ہیں۔

غرض یہ لوگ ثمرات ہوتے ہیں جو ہر زمانہ میں قرآن کریم کی عملی زندگی کے ثمرات میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور لازمی طور پر ایسا وجود ہر صدی کے سر پر آتا ہے۔

پانچویں علامت

پانچویں علامت یہ کہ اس شجرہ کا طیبہ کے ثمرات طبعی قانون کے نیچے نہیں ہوتے بلکہ اذنِ ربانی پر موقوف ہوتے ہیں۔ اسی طرح کلام الٰہی کے یہ ثمرات جن کا مختصر، تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ یہ بھی اذنِ ربی کی شان لئے ہوئے ہوتے ہیں حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے تفسیر کبیر میں اس پر مفصل بحث فرمائی ہے، ایمان و عرفان کی ترقی کیلئے اسے ضرور پڑھنا چاہئے۔

کلمہ طیبہ کی مثال کے متعلق کچھ اور

یہاں تک میں نے کلمہ طیبہ کی مثال شجر طیب

کے متعلق مختصراً بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ اور بھی قرآن کریم کی روشنی میں بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

اس مثال میں کلمہ طیبہ کو جس درخت طیب سے مثال دی ہے اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی شاخیں آسمان میں ہیں جہاں اس سے یہ مراد ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم ہر پہلو سے مکمل اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے کامل رہنما ہے وہاں اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ایک زمینی انسان آسمانی بن جاتا ہے۔ اور قرب الٰہی کو پا لیتا ہے اس مفہوم اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کے مندرجہ ذیل مقامات پر غور کرو۔

(۱) پارہ ۲۲ سورہ الفاطر رکوع ۲ آیۃ ۱۱

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝

(سنو!) جو چاہتا ہے کہ معزز ہو (تو یاد رکھو) تمام عزتیں تو اللہ تعالےٰ ہی کے لئے ہیں یعنی وہی ہر قسم کی عزت کا سرچشمہ ہے اسکی طرف پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں اور اعمال صالحہ (کرنے والوں کو) بلند کرتے ہیں اور جو لوگ بری مخفی تدبیریں کرتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہے اور انکی مخفی تدبیریں ہلاک ہو جائیں گی (یعنے خود انکی ہلاکت کا موجب ہو جائیں گی)

مجھ کو اس مقام پر کوئی تفصیلی تفسیر بیان کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ کلمہ طیب اور اس کے موافق عمل صالح انسانی مراتب میں رفعت بخشتا ہے اور اس کا صعود العزیز اللہ کی طرف ہوتا ہے۔

صعود و نزول

ایمان کامل اور اس ایمان کے موافق اعمال انسانی کی، روحانی رفعت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور وہ قرب الٰہی کی طرف صعود کرتا ہے اور اس صعود کے بعد اس کا ایک نزول بھی ہوتا ہے جبکہ خود اس کا وجود نافع الناس بن جاتا ہے جیسے ایک ثمردار درخت کی شاخیں جس قدر بلند ہوتی جاتی ہیں وہ زیادہ ثمردار ہوتی ہیں اور انسان کے لئے ایک حد تک مایہ حیات بنتی ہے۔

کلمہ طیبہ کے مقابل کلمہ خبیثہ

اس آیت میں کلم الطیب کے مقابل جن اعمال کا ذکر کیا ہے صاف ظاہر ہے کہ وہ کلم الخبیث ہیں اور ان کی اصولی تعریف یمکرون السیات کے لفظ میں کردی گئی ہے کہ ان کی ہر تجویز ہر منصوبہ بدیوں کا منبع ہوتا ہے۔

اس آیت میں اس مضمون کی طرف بھی اشارہ نہیں بلکہ صراحت ہے کہ مومن اور اعمال صالحہ بجا لانے والی جماعت کے مقابلہ میں دشمن کا ہر منصوبہ اور ہر تدبیر ناکام اور ان کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے اور مومن کے مدارج کی رفعت و عزت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس حقیقت کو قرآن مجید حیات طیبہ قرار دیتا ہے چنانچہ فرمایا سورۃ النحل پارہ ۱۴ رکوع ۱۳ آیۃ ۹۸

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً ۚ وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

جس کسی نے بھی عورت ہو یا مرد عمل صالح کیا (عمل صالح جو ہر رنگ میں صلاحیت پیدا کرے) اور وہ مومن ہو تو ہم ضرور ضرور انہیں ایک پاکیزہ زندگی بخشیں گے۔ اور ہم یقیناً انکے بہترین اعمال کا بہترین بدلہ دینگے

اس میں حیات طیبہ کی حقیقت کو مبرہن کیا ہے جس کو دوسرے مقام پر کلم الطیب کے نتائج میں صعود الی اللہ بتایا گیا ہے۔

میں قارئین کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ ایک مختصر اشارہ کو مد نظر رکھ کر قرآن کریم پر غور کریں گے۔ تو کلم الطیب اور شجر الطیب کے متعلق ایک وسیع علم ایمانیات اور اعمال صالحہ کے متعلق ملے گا۔ مجھے، ایک اس کتاب کے ضخیم ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں فرعہا فی السماء کے تحت قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم کی تفصیل کرتا۔ تاہم میں توجہ دلاتا ہوں کہ وہ میری کتاب احکام القرآن پڑھیں۔

شجرہ خبیثہ

اس مثال کے ختم کرنے کے لئے اب مجھے صرف کلمۃ الخبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ پر ایک نوٹ لکھدینا ضروری ہے۔

خبیث سے مراد ہر وہ گندی چیز ہے جس سے نفرت پیدا ہو اور یہ طیب کی ضد ہے۔ جو خوبیاں طیب میں اور کلمۃ الطیب میں ہیں اس کے بر خلاف کلمۃ الخبیثۃ ہے۔ حق کی مثال

شجرۃ الطیب سے دی ہے اور اس کے مقابل باطل شجرۃ الخبیثہ ہے۔ اور قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بطور ایک جڑ کے ہے اور اعمال صالحہ جو اس کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں بطور شاخوں کے ہیں گویا ایمان اور اعمال صالحہ مل کر ایک شجر طیب کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح پر اس کے مقابلہ میں بے ایمانی اور ہر قسم کی بدیاں مل کر ایک شجر خبیثہ کی صورت اختیار کرتی ہیں لیکن یاد رہے کہ وہ تمام عقاید باطلہ اور اعمال سیئہ سے بنا ہوا شجر قرار پا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ انکی کوئی جڑ مضبوط نہیں۔ دلائل عقلیہ اور مشاہدات فطرت انکی تائید نہیں کرتے۔

شجرۃ الملعونہ اور شجرۃ الزقوم

میں نے اس امر کی بارہا وضاحت کی ہے کہ قرآن مجید اپنے مطلب کو مختلف رنگوں میں قریب الفہم کرتا ہے اور مختلف مقامات پر ایک دوسرے کی توضیح اور تفسیر کرتا ہے۔ یہاں شجرۃ الخبیثہ کی جو مثال دی ہے اگرچہ اس میں صاف طور پر لفظ خبیثہ ہی اس کی حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ ہر قسم کی قابل نفرت چیزیں اس میں داخل ہیں لیکن قرآن کریم نے دوسری جگہ اس کو شجر ملعونہ فرمایا

دیکھو سورۃ بنی اسرائیل پارہ ۱۵ آیۃ ۶۱ رکوع ۶

ھ۔ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۟

اور رویا دکھا جبکہ ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرے رب نے یقیناً ان لوگوں کا احاطہ کر لیا ہوا ہے۔ (یعنی ان کی ہلاکت کا فیصلہ کر دیا ہے) اور جو رویا ہم نے تجھکو دکھایا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کی آزمایش کا تھا۔ اسی طرح اس درخت کو بھی جسے قرآن میں ملعون قرار دیا گیا ہے۔ (ذریعہ امتحان قرار دیا ہے) اور باوجود اس کے کہ ہم انہیں تنبیہ کرتے چلے جاتے ہیں پھر بھی وہ اثر پذیر نہیں ہوتے (بلکہ) وہ اپنی سرکشیوں میں اور زیادہ بڑھتے جاتے ہیں۔

ایک قابل غور نقطہ

یہاں آگے چلنے سے پہلے میں ایک قابل غور نکتہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو ایک کلید ہے اس ساری مثال کلمۃ الخبیثۃ کے سمجھنے کی۔ اس مقام پر جہاں شجر ملعونہ کا ذکر کیا ہے آگے اللہ تعالیٰ آدم و ابلیس کے واقعہ کو پیش کر رہا ہے اور آیۃ ۶۵ تک اس کا بیان کیا ہے۔ اس سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی۔ کہ شجر ملعونہ کا تعلق ابلیس سے بھی ہے۔

شجرۃ الملعونہ ایک امتحان ہے

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شجرۃ ملعونہ ایک امتحان ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ اس کے معاً بعد اللہ تعالیٰ نے آدم اور ابلیس کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور ابلیس کی اس نافرمانی پر جو اس نے سجدہ آدم سے انکار کی وجہ سے کی اللہ تعالیٰ نے اسے ملعون قرار دیا جیسا کہ سورۃ الحجر پارہ ۱۴ رکوع ۲ آیۃ ۳۵ و ۳۶ میں فرمایا

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝

(اس انکار سجدہ پر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا نکل جا تو یقیناً دھتکارا گیا ہے
اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت ہے۔

میں نے شجر ملعونہ کی صراحت کے لئے اس آیت کو پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے سیاق و سباق اور ابلیس کے ابیٰ واستکبار پر جب غور کیا جاوے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ وہ شجر ملعونہ کس طرح پیدا ہوتا ہے اور اسکی جڑ اور بنیاد ابیٰ واستکبار ہے اور یہ خباثت انبیاء علیہم السلام کے انکار کا موجب ہو کر ظالم بنا دیتی ہے۔

شجر ملعونہ کیا ہے؟

اس قدر بیان کے بعد میں مختصراً قرآن کریم کی روشنی میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ شجر ملعونہ کیا ہے۔ بنی اسرائیل کی آیۃ میں اس شجر کو فتنۃ للناس قرار دیا ہے۔ اور قرآن کریم سورہ صافات پارہ ۲۳ رکوع ۲ آیۃ ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷ میں ایک ایسے شجرۃ کا ذکر کیا ہے جس کو فتنہ قرار دیا ہے میں صرف یہاں پہلی دو آیات درج کر دوں گا۔ اور باقی کا ترجمہ

أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۝

کیا یہ بہتر مہمانی ہے یا تھوہر کا درخت (۶۲) ہم نے اسے ظالموں کے لئے ذریعہ امتحان بنایا ہے (۶۳) وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی جڑ میں اگتا ہے (۶۴) اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے شیطان کا سر (۶۵) پس وہ یقیناً اسے کھائیں گے پھر اسکے ساتھ پیٹوں کو بھریں گے (۶۶) پھر اس کے اوپر ان کے لئے کھولتے ہوئے پانی کی ملونی،

ہوگی (۶۷) پھر یقیناً ان کا دوزخ ہی کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا

یہ بھی ایک مثال ہے

یاد رکھو کہ یہ بھی ایک مثال ہے جس طرح پر نعمائے جنت کی مثال قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ اسی طرح دوزخ کی یہ ایک مستقل مضمون ہے میں یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتا صرف اس قدر کہتا ہوں جنت اور دوزخ انسان کے اعمال کے ثمرات کی ایک صورت ہے۔ جس طرح اعمال صالحہ اور ایمان کامل کے ثمرات کی مثال باغات و ثمرات نخل واعناب کے رنگ میں دیگئی ہے۔ دوزخ جس درخت کو پیدا کرتا ہے وہ زقوم ہے۔ وہ تھوہر کا درخت جو ہم دنیا میں دیکھتے ہیں وہ تو سمجھانے کے لئے ہے جو شکل وصورت اس کی بیان کیگئی ہے وہ کیسی مکروہ ہے۔ اور وہ ایک کانٹے دار درخت ہے دوزخ کی جڑ میں پیدا ہونے والا زقوم وہ اعمال بد ہیں جو ایسے انسان کی دوزخ کو تیار کرتے ہیں اور اسے ملعون بنا دیتے ہیں۔ اور ہر قسم کی بدیوں اور بدکاریوں کی تحریک شیطان ملعون سے ہوتی ہے اس لئے وہ شجر ملعونہ ہے۔ اور چونکہ لعنت کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ تعلق کو قطع کر کے اسے مجرم بنا دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ جس جس قدر انسان بدیوں میں مبتلا ہوتا ہے اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے قرب سے دور ہوتا جاتا ہے۔

خلاصۃ الکلام

الغرض اس ساری مثال کلمۃ الطیبہ اور کلمۃ الخبیثہ میں ایمان واعمال صالحہ کے نتائج اور اس کے برخلاف

بدیوں اور بدکاریوں کے ثمرات اور حق و باطل کے مقابلہ قرآن کریم اور حضرت
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و کامیابی کے معیار کو پیش کیا ہے۔ ختم
کرتے ہوئے میں ان تبرکات کو درج کرتا ہوں جو حضرت امام الزمان
علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۸۹۶ء کے جلسہ مہوتسو میں بیان فرمائے

مکافات عمل

پس جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے
ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وہ نتیجہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے
ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ ان دو مثالوں
میں صاف فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا
فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ یعنی جو لوگ اس فعل کو بجا لائے کہ انہوں نے
خدائے تعالیٰ کی جستجو میں پوری کوشش کی تو اس فعل کیلئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل
ہوگا۔ کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دینگے۔ اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ
پر چلنا نہ چاہا۔ تو ہمارا فعل انکی نسبت ہوگا۔ کہ ہم انکے دلوں کو کج کر دینگے اور پھر اس
حالت کو زیادہ توضیح دینے کیلئے فرمایا مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ
اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا یعنی جو شخص اس جہاں میں اندھا رہا وہ آنیوالے جہاں میں
بھی اندھا ہوگا۔ بلکہ اندھوں سے بدتر یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیک بندوں
کو خدا کا دیدار اسی جہاں میں ہو جاتا ہے اور وہ اسی جگہ میں اپنے اس پیارے
کا درشن پا لیتے ہیں جس کیلئے وہ سب کچھ کھوتے ہیں۔ غرض مفہوم اس آیت کا یہی ہے
کہ بہشتی زندگی کی بنیاد اسی جہاں سے پڑتی ہے۔ اور جہنمی نابینائی کی جڑ بھی
اسی جہاں کی گندہ اور کورانہ زیست ہے اور پھر فرمایا وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اچھے اعمال بجا لاتے ہیں وہ ان باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پس واضح رہے کہ اس جگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں تبلایا گیا ہے کہ جو رشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے وہی رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے۔ پس جیسا کہ کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا ایسا ہی کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زندہ ایمان نہیں کہلا سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں تو وہ ایمان ہیچ ہے اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہوں تو وہ اعمال ریاکاری ہیں۔ اسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا کے ایمان اور عمل کا ایک ظل ہے۔ وہ کوئی نئی چیز نہیں جو باہر سے آکر انسان کو ملے گی بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر ہی سے نکلتی ہے اور ہر ایک کی بہشت اسی کا ایمان اور اسی کے اعمال صالحہ ہیں جن کی اسی دنیا میں لذت شروع ہو جاتی ہے۔ اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں اور نہریں بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسوس ہوں گے خدا تعالیٰ کی پاک تعلیم ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ سچا اور پاک اور مستحکم اور کامل ایمان جو خدا اور اس کے ارادوں کے متعلق ہو وہ بہشت خوشنما اور بارور درخت ہے اور اعمال صالحہ اس بہشت کی نہریں ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ۔ یعنی وہ ایمانی کلمہ جو ہر ایک افراط تفریط اور نقص اور خلل اور کذب اور ہزل سے پاک اور من کل الوجوہ کامل ہو اس درخت کے مشابہ ہے جو ہر ایک عیب سے پاک ہو جس کی جڑیں زمین میں قائم اور شاخیں آسمان میں ہوں اور اپنے پھل کو ہمیشہ دیتا ہو اور کوئی وقت اس پر نہیں آتا کہ

شاخوں میں پھل نہ ہوں۔ اس بیان میں خدا تعالیٰ نے ایمانی کلمہ کو ہمیشہ پھلدار درخت سے
مشابہت دیکر تین علامتیں اسکی ظاہر فرمائیں (۱) یہ کہ جڑ اسکی جو اصل مفہوم سے مراد ہے
انسان کے دل کی زمین میں ثابت ہو یعنی انسانی فطرت اور انسانی کانشنس نے اس کی
حقانیت اور اصلیت کو قبول کر لیا ہو (۲) دوسری علامت یہ کہ اس کلمہ کی شاخیں
آسمان میں ہوں --- یعنے معقولیت اپنے ساتھ رکھتا ہو اور آسمانی قانون قدرت جو
خدا کا فعل ہے اس فعل کے مطابق ہو جس کا مطلب یہ کہ اسکی صحت اور اصلیت کے دلائل
قانون قدرت سے مستنبط ہو سکتے ہیں اور نیز یہ کہ وہ دلایل ایسے اعلیٰ ہوں کہ گویا آسمان
میں ہیں۔ جن تک اعتراض کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ (۳) تیسری علامت یہ ہے کہ وہ پھل جو
کھانے کے لایق ہے۔ دائمی اور غیر منقطع ہو یعنے عملی مزاولت کے بعد اس کی برکات و
تاثیرات ہمیشہ اور ہر زمانہ میں مشہود اور محسوس ہوتی ہوں یہ نہیں کہ کسی خاص
زمانہ تک ظاہر ہو کر پھر آگے بند ہو جائیں۔ اور پھر فرمایا مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ
خَبِیْثَۃِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ یعنی پلید کلمہ اس درخت کے
ساتھ مشابہ ہے جو زمین میں اکھڑا ہوا ہو یعنی فطرت انسانی اسکو قبول نہیں کرتی۔ اور کسی
طور سے قرار نہیں پکڑتا نہ دلایل عقلیہ کی رو سے نہ قانون قدرت کی رو سے صرف قصہ
اور کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے اور جیسا کہ قرآن شریف نے بتایا ہے کہ عالم آخرت میں
ایمان پاک کے درخت انگور اور انار عمدہ عمدہ میووں کی صورت میں متمثل ہوں گے اور دکھائی
دیں گے ایسا ہی بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالم آخرت میں زقوم رکھا ہے جیسا
کہ وہ فرماتا ہے اَذٰلِکَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰ
لِمِیْنَ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْۤ اَصْلِ الْجَحِیْمِ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ کَالْمُھْلِ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ۔ ذُقْ
اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ۔ یعنی تم بتلاؤ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں یا زقوم کے درخت
جو ظالموں کیلئے ایک بلا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی جڑھ میں سے نکلتا ہے۔ یعنی
تکبر اور خود بینی سے پیدا ہوتا ہے یہی دوزخ کی جڑ ہے اس کا شگوفہ ایسا ہے جیسا کہ
شیطان کا سر۔ شیطان کے معنے ہیں ہلاک ہونے والا یہ لفظ شیط سے نکلا ہے۔ پس
حاصل کلام یہ ہے کہ اس کا کھانا ہلاک ہونا ہے اور پھر فرمایا کہ زقوم کا درخت ان
دوزخیوں کا کھانا ہے جو عمداً گناہ کو اختیار کر لیتے ہیں وہ کھانا ایسا ہے جیسا کہ تانبا
گلا ہوا کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں جوش مارنے والا پھر دوزخی کو مخاطب کر کے
فرماتا ہے کہ اس درخت کو چکھ تو عزت والا اور بزرگ ہے اور یہ کلام نہایت غضب
کا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تو تکبر نہ کرتا اور اپنی بزرگی اور عزت کا پاس
کر کے حق سے منہ نہ پھیرتا تو آج یہ تلخیاں تجھے اٹھانی نہ پڑتیں یہ آیت اس بات کی
طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ دراصل یہ لفظ زقوم کا ذُق اور اَم سے مرکب ہے اور اُمْ اِنَّکَ اَنْتَ
الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ کا ملخص ہے۔ جس میں ایک حرف پہلے کا اور ایک حرف آخر کا موجود ہے
اور کثرت استعمال نے ذال کو زا کے ساتھ بدل دیا ہے اب حاصل کلام یہ ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ
نے اسی دنیا کے ایمانی کلمات کو بہشت کے ساتھ مشابہت دی ہے ایسا ہی اسی دنیا
کے بے ایمانی کے کلمات کو زقوم کے ساتھ مشابہت دی اور اس کو دوزخ کا درخت
ٹھیرایا۔ اور ظاہر فرما دیا کہ بہشت اور دوزخ کی جڑھ اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے
جیسا کہ دوزخ کے باب میں ایک اور جگہ فرماتا ہے نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ
عَلَی الْاَفْئِدَۃِ۔ یعنی دوزخ وہ آگ ہے جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے۔

اور گناہ سے بھڑکتی ہے اور پہلے دل پر غالب ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس خبیث کی اصل جڑ وہ غم اور حسرتیں اور دردہیں جو دل کو پکڑتے ہیں کیونکہ تمام روحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں اور پھر تمام بدن پر محیط ہوجاتے ہیں اور پھر ایک جگہ فرمایا وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ یعنی جہنم کی آگ کا ایندھن جس سے وہ آگ ہمیشہ افروختہ رہتی ہے دو چیزیں ہیں۔ ایک وہ انسان جو حقیقی خدا کو چھوڑ کر اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں یا انکی مرضی سے انکی پرستش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ یعنی تم اور تمہارے معبود باطل جو انسان ہو کر خدا تعالیٰ کہلاتے رہے۔ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (۲) دوسرا ایندھن جہنم کا بت ہیں مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا وجود نہ ہوتا تو جہنم بھی نہ ہوتا۔ سو ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں بہشت اور دوزخ اس جسمانی دنیا کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کا مبدء اور منبع روحانی امور ہیں۔ ہاں وہ چیزیں دوسرے عالم میں جسمانی طور پر نظر آئیں گی۔ مگر اس جسمانی عالم سے نہیں ہوں گی۔

(۷) عالم بے عمل کی مثال

(۷) عالم بے عمل کی مثال

قرآن کریم خود ایک کتاب العمل ہے اور انسانی زندگی اور اسکی ترقیات کا مدار عمل پر ہے۔ بلکہ زندگی کی علامت ہی عمل ہے۔ اور کسی عمل کے لئے علم نہایت ضروری ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی پہلی وحی ہی علم کی ہدایت کرتی ہے۔ اور علم کی کوئی انتہا قرار نہیں دیتا بلکہ رب زدنی علما کی دعا تعلیم کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ باوجود علم کے تارک عمل ہوں۔ قرآن مجید ان کی حالت کو ایک مثال کے ذریعہ ظاہر فرماتا ہے۔ چنانچہ پارہ ۲۸ سورۃ الجمعہ رکوع اول آیۃ ۵ میں فرمایا

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

ان لوگوں کی مثال جن لوگوں پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا گدھے کی مثال کی طرح ہے جس پر بوجھ کتابوں کا لدا ہوا ہو۔ کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اللہ تعالےٰ ایسے ظالموں کو کامیاب نہیں کرتا۔

تشریحی نوٹ یہ آیت بظاہر یہودی علماء کی حالت کا اظہار کرتی ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک اصول علم و عمل کے نتائج کو پیش کر رہی ہے

اور چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات میں آخری زمانہ کے علماءؐ کے متعلق پیشگوئیاں ہیں کہ زیر آسمان بدترین مخلوق ہوں گے اور ہر قسم کے فتن کا مرکز ہوں گے۔ اور یہود کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں گے۔ اس لئے اس کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے۔ ایک عالم دین اگر عمل نہیں کرتا تو اس کی مثال اس گدھے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں

چارپائے بر د کتابے چند کا مصداق ہے

اور قرآن کریم نے اسی مقام پر مکذبین آیات اللہ کو بھی اسی کا مصداق قرار دیا ہے اور اس کو بدترین مثال کہا ہے جیسا کہ فرمایا کہ کیا ہی بری مثال ہے اس قوم کی جس نے آیات کی تکذیب کی اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے ایسے لوگ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہدایت پا سکتے ہیں۔

گدھے کی مثال کا پس منظر

گدھے کی مثال کے پس منظر میں بصائر و عبر کا ایک دفتر ہے قرآن کریم نے کائنات کے مختلف عالم بیان کئے ہیں عالم حیوانات۔ عالم طیور۔ عالم وحوش۔ عالم حشرات الارض وغیرہ عالم حیوانات میں گدھے کا بھی ذکر ہے۔

ایک تو اسی مثال میں جو علمائے یہود کی بد عملیوں کی وجہ سے انہیں گدھے قرار دیا کہ صرف علم پڑھ لینے سے انسان میں وہ نور اور خشیت الٰہی پیدا نہیں ہوتی جب تک اس پر عمل نہ کیا جاوے۔ ولنعم ماقیل ؎

علم آں بود کہ نور فراست رفیق اوست

ایں علم تیرہ را بہ پشیزے نمے خرم

دوسرے گدھے کا ذکر سورۃ لقمان پارہ ۲۱ آیت ۱۹ رکوع ۳ میں کیا

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝

اور (دیکھو) اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آوازوں کو نیچا رکھو یقیناً سب سے بری آواز گدھے کی ہے۔

اگرچہ یہاں آداب رفتار و آداب گفتار تعلیم کئے گئے ہیں کہ انسان کو چلتے وقت وقار کی رفتار سے چلنا چاہئے اس کے یہ معنے نہیں کہ انسان سست رفتار ہو تیز رفتار نہ ہو۔ نہیں بلکہ رفتار میں ایک وقار ہو۔ اور گفتار میں چیخنا چلانا نہ ہو۔ بلکہ اس میں بھی ایک متانت اور وقار کا پہلو ہو۔ اس سے بھی یہ مراد نہیں کہ آہستہ بولے۔ آواز میں موقع تقریر و خطاب کے لحاظ سے کبھی جوش سے اور کبھی نہایت سکون سے بات کرنی ہوتی ہے بہرحال آداب گفتگو میں بے معنے چیخ و پکار نہیں ہونی چاہئے ورنہ ایسی آواز والا انسان بھی گویا گدھا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی آواز بدترین آواز ہے۔

اس طرح پر علمائے سوء کو گدھے کی مثال میں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ بے عمل ہوتے ہیں اس علم سے جو انہوں نے پڑھا نہ تو خود نفع اٹھاتے ہیں (نفع سے مراد دنیا کے سکے نہیں۔ بلکہ اس علم کے ذریعہ انہیں خشیت اللہ اور احکام الٰہی کی اطاعت اور ملکوتی صفات پیدا ہونے چاہییں۔ ورنہ وہ علم ان کے لئے صرف بڑا بوجھ ہو جائے گا۔ اور انکی حیثیت ایک گدھے سے زیادہ نہ ہوگی) اور نہ دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں۔

علم کا کمال یہ ہے کہ وہ خشیت اللہ کو پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا

پارہ ۲۲ سورہ فاطر رکوع ۴ آیۃ ۲۸

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ

اور لوگوں میں سے اور جانداروں اور چار پایوں میں سے اسی طرح ان کے رنگ مختلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خشیت صرف ان لوگوں میں ہے۔ جو عالم ہیں اور اللہ العزیز اور غفور ہے۔

اس آیۃ اور اس سے پہلی آیت میں کائنات میں جمادات ہوں یا نباتات حیوانات ہوں یا انسان سب میں ایک قسم کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف اللہ کی ہستی کی ایک دلیل ہے اور بھی مختلف حقایق اس اختلاف میں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت حقیقی علم والوں ہی کو حاصل ہوتی ہے بظاہر یہ بے تعلق سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے مختلف طبقوں کے علم اختلاف سے مومن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت کا ایک اثر پیدا ہوتا ہے اور وہ اثر اس کے قلب میں رقت اور اللہ کے ساتھ محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے چنانچہ اس کے اگلی آیت میں ان علماء کا تو ذکر کیا ہے جو اس بے عمل عالم اگر ہے کی منزل کی توضیح کرتی ہے۔ فرمایا

یہ لوگ کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں وہ نمازوں کو قائم کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اس

ذریعہ سے) وہ ایسی تجارت کے امید وار ہیں۔ جو تباہ نہیں ہو گی تاکہ انہیں پورے اجر دیئے جائیں اور اللہ تعالے اپنے فضل سے بڑھا کر دے بے شک وہ غفور اور شکور ہے۔"

اس بیان کو اگلی آیات میں اور واضح کیا ہے۔ مجھے صرف اسی قدر بتانا ہے کہ علم حقیقی۔۔۔ عمل صحیح کو چاہتا ہے جو لوگ رسمی علوم پڑھ کر تکبر و نخوت کا حجاب پہن لیتے ہیں اور اپنی بدعملیوں کے لئے شرعی حیلے تراشتے ہیں۔ جیساکہ علمائے یہود کا حال تھا ان کی مثال

گدھے کی ہے اور ایسے لوگ باوجود علم کے ہدایت نہیں پا سکتے

اور اسی حقیقت کی طرف حضرت سید الاولین والاخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **العلم حجاب الاکبر**

علماء اور اکل بالباطل

قرآن کریم نے اہل کتاب کے علماء کے اکل بالباطل کا بھی ذکر کیا ہے۔

سورۃ توبہ پارہ ۱۰ رکوع ۶ آیۃ ۳۵

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط

مومنو! یقیناً بہت سے علماء اور راہب لوگوں کا مال باطل سے کھاتے ہیں (یعنی جھوٹ اور فریب کے طریقوں سے) اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں

یاد رکھنے کی بات

قرآن مجید نے خصوصیت سے بنی اسرائیل کی ان بدعملیوں

کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھیں اس کے بیان کا مقصد مسلمانوں کو آگاہ کرنا تھا وہ اس قسم کے معائب سے پرہیز کریں۔

اس آیت میں انکی حرام خوری کا ذکر کیا ہے حالانکہ علماء کو تو چاہئے تھا کہ لوگوں کو تزکیہ نفس اور علم الکتاب سے آگاہ کرتے اور حقیقی علم کے حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرتے۔

یہ بھی یاد رہے کہ بے عمل عالم کی مثال سورۃ **جمعہ** میں بیان کیگئی ہے۔ جس میں آخری زمانے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ثانیہ کا ذکر ہے۔ اور اسی آخری زمانہ میں یہود سے مماثلت کی پیشگوئی حضور نے فرمائی۔

غرض بے عمل عالم کی مثال اس گدھے کی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ ہے۔

(۸) بارش کی مثال

(تمہیدی نوٹ) قرآن مجید نے بارش کی دو قسم کی مثالیں بیان کی ہیں ایک تو بارش کی مثال وحی الٰہی کی حقیقت کے سمجھانے کے لئے دی ہے اس کو بڑی شرح و بسط سے قرآن مجید نے بیان کیا ہے دوسرے بارش کی مثال میں منافق کی حقیقت کو میہن کیا ہے۔ میں پہلے اس مثال کو بیان کروں گا جو منافق کے متعلق ہے اس لئے کہ وہ مختصر ہے۔ اور وحی الٰہی کی مثال تفصیل طلب ہے اس لئے وہ بعد میں انشاء اللہ تفصیل سے بیان کرنے کی توفیق کا امیدوار ہوں

---

(۱) بارش کی مثال اور منافق

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی صداقت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو مامور کرتا ہے تو تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کھلم کھلا اس صداقت اور مامور پر ایمان لاتے ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی قربانی میں ایک مسرت پاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو برملا اس کا انکار کرتے ہیں

اور نہ صرف انکار بلکہ اسکی پوری قوت سے مخالفت کرتے ہیں اور یہ کافر ہوتے ہیں ایک تیسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو قوت فیصلہ اور تاب مقابلہ نہیں رکھتے وہ ایک بین بین راہ اختیار کرتے ہیں مومنوں سے ملتے ہیں تو اظہار ایمان کرتے ہیں اور جب مخالفین اسلام سے ملتے ہیں تو اظہار ایمان کرتے ہیں اور جب مخالفین اسلام سے ملتے ہیں تو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ قرآن کریم اس قسم و قماش کے لوگوں کو منافق قرار دیتا ہے منافقین کے علامات ان کے اعمال کا نقشہ قرآن مجید نے مختلف رنگوں میں بیان کیا ہے بلکہ ایک مستقل سورۃ قرآن مجید میں سورۃ المنافقون کے نام سے نازل ہوئی

دو قسم کے منافق

پھر ان منافقین کے بھی دو اقسام ہیں ایک وہ ہوتے ہیں جو صرف ظاہر داری اور ذاتی مفاد کے لئے مومنوں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں ان کے دل میں اس صداقت و ہدایت کے لئے جو اللہ تعالی کا مامور پیش کرتا ہے کوئی وقعت نہیں ہوتی وہ اسے جھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ صرف ماحول کے اثر کے نیچے ذاتی مفاد کے لئے اظہار معیت کرتے ہیں دوسری قسم ان منافقوں کی ہے جو اس ہدایت اور مامور من اللہ کی صداقت کو مانتے ہیں اور دلایل عقلیہ یا دوسرے حالات کے ماتحت انکو یقین صداقت ہوتا ہے مگر ان کے قلوب میں وہ قوت نہیں پائی جاتی کہ وہ اس صداقت کو قبول کرنے سے جو ابتلاء آتے ہیں۔ یا جو قربانیاں کرنی پڑتی ہیں انہیں عملاً عہدہ برا ہو سکیں۔ یہ لوگ وقتی حالات کے ماتحت ادہر ادہر جھکتے رہتے ہیں۔ کافروں سے

ملے تو ان کی ہاں میں ہاں ملا دی اور مومنین سے ملے تو انکی تائید کی غرض
یہ لوگ جو قرآن کریم کی اصطلاح میں منافقین کہلاتے ہیں اپنے دو
گونہ اعمال کی وجہ سے بارش سے ایک مناسبت رکھتے ہیں قرآن مجید نے
ان دونوں قسم (اعتقادی اور عملی) منافقین کی مثال بیان کی ہے۔
جس کو ذیل میں بیان کرتا ہوں وباللہ التوفیق

منافقین کے اعمال اور ان کے علامات قرآن کریم میں تفصیل
سے بیان ہوئے ہیں اس پر بحث اس وقت میرے زیر نظر نہیں بلکہ قرآن
کریم نے جو انکی دو مثالیں بیان کی ہیں جو اعتقادی اور عملی منافقین
کی مثال ہے۔ اسی کا اظہار مقصود ہے۔ اسی خصوص میں میں نے فروری
۱۹۰۱ء میں تفسیر القرآن کا پہلا پارہ شائع کیا تھا اور اس میں ان
مثالوں کی تشریح کی تھی آج پچاس بلکہ ۵۱ برس بعد بھی اس پر کچھ
اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا اس لئے اسکو ہی یہاں درج کر دیتا ہوں

اعتقادی منافق کی مثال

خدا تعالےٰ اعتقادی اور عملی منافق کی تفریق
دو عام فہم اور مشاہدہ میں آئی ہوئی مثالوں کے
ذریعہ بیان فرماتا ہے اعتقادی منافق کی مثال یہ ہے مثلھم کمثل
الذی استوقد نارا فلما اضاءت ما حولہ ذھب اللہ بنورھم
وترکھم فی ظلمت لا یبصرون ۝ صم بکم عمی فھم لا
یرجعون یعنی منافق اعتقادی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی صحرا
نشین (آفات جنگل یعنے درندوں اور جنگلی جانوروں کے حوادث سے

محفوظ رہنے کے لئے آگ جلائے۔ پس جب آگ خوب روشن ہوئی۔ اور اس کا ارد گرد بھی منور ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ اس روشنی کو لے گیا اور ان کو تاریکی میں پڑا رہنے دیا اندھوں کی طرح نہیں دیکھ سکتے حق کے شنوا نہیں حق کے گویا نہیں اور حق کے بینا نہیں۔ پس وہ واپس نہ ہونگے یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب صحراؤں اور خوفناک جنگلوں میں رات آجاتی ہے تو راہ رو آگ جلا لیتے ہیں تاکہ صحرائی جانور اور جنگلی درندوں اور دیگر حوادثات و آفات سے محفوظ رہیں۔ مگر کیا وہ من کل الوجوہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں جونہی آگ بجھی پھر وہ اپنے تئیں موت کے منہ میں سمجھیں ٹھیک اسی طرح پر اعتقادی منافق ان تکالیف اور مصائب سے بچنے کے لئے جو مامور من اللہ کے منکرین پر مختلف رنگوں میں آنے والے ہوتے ہیں صرف اقرار باللسان کی روشنی یا ایسے اعمال کے ذریعہ سے (جو تکلف اور تصنع سے صادر ہوتے ہیں نہ بطریق تلذذ) اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور کچھ عرصہ تک ان بادیہ نشین آگ جلانے والوں کی طرح محفوظ بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے آخر کو آگ کی روشنی جاتی رہ کر دھواں اور گرمی چھوڑ کر اس کو معرض بلا میں چھوڑ جاتی ہے۔ اسی طور پر اس کی یہ نمائشی کارروائی آخر کھل جاتی ہے اور بجائے سکھ کے اس کو دکھ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ذھب اللّٰہ بنورھم میں ہم کو یہ سِر معلوم ہوتا ہے کہ جیسا پہلے بیان ہوا اعمال صالحہ پر مزید اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے۔

اور جن قوتوں کا استعمال چھوڑا جاتا ہے وہ ضایع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح چونکہ منافق اپنے اندرونی قویٰ جن میں فطرت سلیمہ اور دل بھی شامل ہیں ان کے استعمال کو تو چھوڑتا ہے اس لیے اعمال جوارح کا پول خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دل کے زیر کمانڈ صادر نہیں ہوتے پس ان کے کرتوت خود ان کو اس عارضی روشنی سے نکال کر خوفناک تاریکی میں پہونچا دیتے ہیں جو ذھب اللّٰہ بنورھم و ترکھم فی ظلمات لا یبصرون میں خدا تعالےٰ نے بیان فرمائی۔

یہ بات بھی مشاہدہ صحیح میں آچکی ہے کہ جب آدمی روشنی سے اندھیرے میں یکایک آجائے تو وہ دیکھ نہیں سکتا۔ پس قرآن کریم کی فلاسفی کیسی صاف اور درست ہے کہ ترکھم فی ظلمات لا یبصرون

مدینہ کے منافقوں نے ہمارے سیّد و مقتدا فخر ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود بلایا چونکہ حضور کا تشریف لے جانا بجائے خود ایک عالم آشوب جنگ تھی اس لئے انہوں نے گویا اپنے ہاتھ سے آگ روشن کی (نار یہ معنی جنگ بھی ہے) مگر جب آپ کے وہاں تشریف لے جانے سے اِدھر اُدھر روشنی پھیلی تو یہ احمق اپنی منافقانہ کارروائیوں کی وجہ سے علیحدہ ہو کر ہلاک ہو گئے۔

پھر فرمایا ایسے منافق یعنے اعتقادی منافق جن کا کانشنس (نور قلب) سُن ہو جاتا ہے بہرے۔ گونگوں اور اندھوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے واپس آنے کی اب کوئی بات نہیں بنتی وہ تو ہلاکت ہی کا

نشانہ ہوں گے۔ دیکھو جو آدمی بہرہ بھی ہو اور گونگا اور اندھا بھی ہو اگر کسی گڑھے میں گر پڑے وہ بھلا پھر کیوں کر نکل سکتا ہے منافق اعتقادی کے ذکر میں ان مقامات پر اس کی حالت بیان کرتے ہوئے قلب کا ذکر نہیں فرمایا۔ کیوں کہ نور قلب تو وہ پہلے ہی کھو چکا ہے۔ جب اس نے اس سے کام ہی لینا نہ شروع کیا تو اس سے فائدہ کیا اٹھائے گا اور اشارہ اس آیت میں موجود ہے فی قلوبہم مرض فزادھم اللّٰہ مرضا یعنے ان کے دلوں میں جو مرض ہے وہ تو اب بڑھے ہی گا۔ بقول شخصے "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" اور حسب نحوائے ان بعض دواء داء یعنے بعض دوا ہلاکت ہوتی ہے۔

اللہ اللہ کیا نظام قرآنی ہے کہ ابتدائی نشان نفاق کی حالت میں تو ذرا مرلض تھا مگر پھر یوماً فیوماً سنت اللہ کے موافق یہ مرض بڑھا یہاں تک کہ ذھب اللّٰہ بنورھم تک نوبت آپہنچی جب دل ضائع ہو گیا تو پھر ترقی کے ذریعے تین ہیں اور عام طور پر اسی طرح پر مشاہدہ آتا ہے

اول :۔ انسان سماعی باتوں سے کچھ واقفیت پیدا کرتا ہے۔ دیکھو بچہ جب بولنا سیکھتا ہے تو پہلے ان آوازوں کو مونہہ سے نکالتا ہے جو اس کے کان میں پڑتی ہیں۔ سننے کے بعد بولنے سے بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور زبان کام دینے لگتی ہے اور یہ بھی نظام قدرت ہے کہ جو بچے بہرے پیدا ہوتے ہیں وہ بول بھی نہیں سکتے اس کو دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ بولنے کے لئے سننا مقدم اور ضروری ہے۔ قرآن کریم نے بھی اسی

طرز پر اس کو بیان کیا ہے پہلے صُمٌّ کہا اور پھر اس کا لازمی نتیجہ بُکمٌ کہا
تیسرا ذریعہ جس سے انسان ترقی کر سکتا ہے وہ آنکھ ہے کیونکہ نظارہ
قدرت کو دیکھتا ہے مگر منافق لوگ نہ کان رکھتے ہیں نہ زبان اور نہ
آنکھ پس ایسے گم کردہ راہ کی سلامتی کی امید کیونکر ہو سکتی ہے ۔ لہذا انپر
یہ فتویٰ ہو چکا ۔ فھم لا یرجعون

اس مقام پر کوئی معترض یہ سوال کر سکتا ہے کہ پھر منافق
اور کافر میں کیا فرق ہے ؟ منافق نے جو اعمال کئے ہیں یہ مانا کہ اس سے
وہ اعمال بطریق احتفاظ جیسا کہ مومن سے صادر ہوتے ہیں نہیں ہوئے
مگر ایک عمل تو اس نے کیا ہے ۔ اسکی جزا اس کو کیوں نہ ملے گی ؟ پس
یاد رکھنا چاہئے کہ اس سوال کو خود مولا کریم نے ہی حل کر دیا ہے ۔
دوسرے مقام پر فرماتا ہے اِنَّ المنٰفقین فی الدرک الاسفل
من النار ۔ پس منافق اوپر کے طبقہ جہنم سے اس لئے بچا کہ اس
نے بظاہر گو نمائشی طور پر ہی سہی کچھ اعمال تو کئے ہیں اور جیسا کہ
ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ چونکہ وہ اعمال بہ طریق تکلف صادر
ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ ایکطرف اندرونی قویٰ جو افعال جوارح
خارجیہ کے محرک ہیں ۔ اور ان پر کمانڈ کرتے ہیں ۔ بیکار ہوتے جاتے
ہیں اور دوسری طرف وہ اعمال ایک قسم کی تکلیف اور بوجھ پیدا
کرتے جاتے ہیں کیونکہ اندرونی قویٰ کے خلاف مرضی صادر ہوتے ہیں
اس لئے خارجی طاقتیں بھی رفتہ رفتہ سلب ہو جاتی ہیں اور یہی وجہ

ہے کہ انکی نسبت فرمایا ہے وما کانوا مھتدین۔ جس میں معناً اول ہدایت سے مراد وہ ہدایت ہے۔ جس کو توفیق کہتے ہیں اور پھر اسی لفظ میں نتیجہ کے طور پر وہ ہدایت مرکوز ہے جس کا نام کامیابی ہے۔

الحاصل

عملی منافق کی مثال

منافق اعتقادی کا ذکر کر کے اب اللہ تعالےٰ منافق عملی کی مثال بیان فرماتا ہے اور اس پر الضالّیں کی تفسیر جو اس رکوع میں شروع کی تھی ختم کر دیتا ہے۔

منافق فی العمل کی مثال یوں دی ہے او کصیب من السماء فیہ ظلمات ورعد وبرق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکافرین۔

یعنی عملی منافق کی مثال اس مینھ کی مانند ہے جو بادل سے برستا ہے جس میں ظلمت، رعد، اور برق تین چیزیں ہوتی ہیں اور کڑک سے مرجانے کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہیں۔ اور اللہ کافروں پر احاطہ کرنے والا ہے جب بارش ہوتی ہے تو اس میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ ظلمت (اندھیرا) رعد (کڑک) اور برق (بجلی) اور تین ہی قسم کی مخلوق مینھ کے وقت ہوتی ہے۔

اول:۔ وہ لوگ ہر طرح سے آرام و آسائش کے ذخیرے رکھتے ہیں اور بادل محل پر بیٹھ کر مینھ کے سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔

دوم وہ لوگ جو عین بارش میں راہ چلتے ہیں۔
سوم وہ آدمی جن کے گھر میں پورا ذخیرہ بھی خوراک اور ضروری اشیاء کا نہیں ہوتا اور گھر بھی کچھ کچھ ٹپکتا ہے۔

اب خدا تعالیٰ نے بارش کی مثال سے یہ بتلانا چاہتا ہے کہ جیسے ایک فضل الٰہی ہے جیسے اس عام بارش کے وقت تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح الہام الٰہی کی بارش کے وقت بھی تین ہی قسم کی مخلوق ہوتی ہے ایک تو وہ جو من کل الوجوہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دوم وہ جو بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ سوم وہ جو کچھ فائدہ اٹھاتے ہیں اور نقصان کا احتمال زیادہ ہے۔ آخر الذکر لوگ منافق ہوتے ہیں۔ جو تاریکی میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اسلام کا منور اور درخشاں چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔ اور نہ دوست دشمن میں تمیز کر سکتے ہیں۔

رعد سے مراد ایسے امثال ہیں جن میں بظاہر جان کا خطرہ ہو یا اور ایسی ہی مشکلات و مصائب پیش آنے والے ہوں۔ جیسے زکوٰۃ، جہاد وغیرہ کیونکہ متقی کو ابتداءً ظالم النفسہٖ ہونا پڑتا ہے۔ مگر منافق جو کمزور دل کا انسان ہوتا ہے ان سے ڈرتا ہے۔ اور کم بخت کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ یہ کمزوری بار رنگ لائیگی کیونکہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے آخر نوبت یہ کفر کی رعد کا معاملہ ہو جاتا ہے جس پر واللہ محیط بالکافرین اشارہ کر رہی ہے۔

ان منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ یکاد البرق یخطف ابصارہم

كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

قریب ہے کہ بجلی چکاچوند کر دے انکی آنکھوں کو جبکہ ذرا روشنی ہوتی ہے۔ تو چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو پھر ٹھہر جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سماعت اور انکی بینائی کو لے جاوے کیونکہ وہ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ یعنی منافق جہاں کہیں کچھ مفاد ذاتی دیکھتے ہیں اور کامیابیوں اور فتوحات کی برق ان کی آنکھوں کو چکاچوند کر دیتی ہے پھر روشنی دیکھتے ہی قدم اٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں اور صوم اور صلوٰۃ کے پابند تے ہیں جہاں خطرہ نظر آیا وہیں ٹھہر گئے۔ یہ اشارہ برق میں فرمایا کیونکہ بجلی میں دو ہی خاصیتیں ہیں ایک طرف تو مواد ردیہ کو جلاتی ہے دوسری طرف ہواؤں کو صاف کرتی اور بہت سے مفاد پہنچاتی ہے اسی طرح پر منافق جہاں کامیابی کا پیارا پیارا چہرہ دیکھتا ہے۔ وہاں اسلام کا عالم اور ثنا خواں بنتا ہے ورنہ برا جانتا اور کوستا ہے۔ چونکہ منافق عملی میں سمع اور بصر کا مادہ ابھی موجود تھا جس سے وہ کڑک سنتا اور چمک دیکھتا تھا مگر اس کی متشکک حالت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ کہیں یہ بھی نہ کھو بیٹھے اور منافق عملی کا انجام کفر تک پہونچ جاتا ہے جیسا کہ واللہ محیط بالکافرین سے پایا جاتا ہے۔ اور ان اللہ علی کل شی قدیر کا اشارہ ہے۔

یہاں الضّالّ کی تفسیر ختم ہوئی۔

خدا تعالیٰ نے منافقوں کی اس مثال میں واضح اور بین طور پر دکھلا دیا ہے کہ ہر سلسلہ حقہ جو خدا کی طرف سے قائم ہوگا۔ ضروری ہے کہ اس میں ظلمت، رعد اور برق ہو۔ اگر وہ بالکل کھلا کھلا برق لامع ہو تو یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے اس آیت میں فیہ ظلمت و رعد و برق میں غور کرنے سے پتہ لگتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی حالتیں ظلمت اور رعد کی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں برق آخر میں ہوتی ہے۔ یعنی ان الفاظ کی ترتیب سلسلہ حقہ کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بارش کے وقت دیکھ لو پہلے بادل آتے ہیں پھر وہ گرجتے ہیں۔ پھر ان میں بجلی بھی کوندتی ہے اسی طرح سے کسی سلسلہ حقہ کی ابتداء میں بہت سے ابتلا اور ظلمتیں ہوتی ہیں۔ پھر اس میں رعد ہوتی ہے۔ مخالفوں کے حملے، جان کے خطرے، مال کا اندیشہ، شمائل حقہ پر عملدرآمد کرنے سے برادری کا ڈر، سوسائٹی کے قوانین کا عذر، خود اپنی آرام طلب جان پر ایک قسم کا بوجھ مگر ان ساری باتوں کے بعد آخر یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ کہ جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا حق آجاتا ہے اور باطل اپنی نحوستوں کو لے کر بھاگ جاتا ہے غرض یہ ایک نشان ہے جو سلسلہ حقہ کی شناخت کے لئے بیان کیا گیا ہے پس ابتدائی تکلیف اور مصائب۔ کسی طالب حق کو گھبراہٹ میں نہ ڈالیں اور کوئی ابتلاء و شکوک کا موجب نہ ہو۔ کیوں کہ برق لامع ان سب مشکلات کے بعد ہے۔ کسی قسم کی ظلمت خواہ وہ جہالت کی ظلمت ہو یا کچھ اور، سچی کی سچائی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

ایک ضروری نوٹ کالذی استوقد نارا کے متعلق اس امر پر بھی بحث کی گئی ہے کہ یہ کالذی کون ہے میں نے جیسا کہ مثال نمبر میں بیان کیا ہے قرآن مجید کی ہدایات اور تعلیمات ابدی ہیں اس لئے مثال تو بآسانی تفہیم کے لئے ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہم اس شخص کا بھی پتہ چلائیں جس کا ذکر نکرہ کے رنگ میں ضمن مثال میں آیا ہو اس لئے میں نے ۱۵ برس پیشتر بھی ایک حالت مشاہدہ اور مناظر قدرت کی اولان مثالوں کو پیش کیا تھا اور اس لئے میں نے امثال القرآن کو تشخصات کے رنگ میں پیش نہیں کیا۔ البتہ جہاں کسی کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے کوئی مثال بیان کی ہے اسے میں اسی رنگ میں سمجھتا ہوں جیسا اسی سلسلہ میں

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم

میں بحولہ تعالیٰ بحث کر دوں گا۔

(۹) اندھی تقلید کرنے والوں کی مثال

تمہیدی نوٹ:۔ قرآن کریم عقل و فکر کی قوتوں سے کام لینے کی ہدایت کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے انسان کو ان خداداد قوتوں کی عملی تربیت کے طریقے بتاتا ہے انبیاء علیہم السلام کے انکار کا ایک سبب یہی کورانہ تقلید ہوتی ہے جسے منکرین و مکذبین اپنے آباؤ اجداد کے طرزِ عمل کے رنگ میں اختیار کرتے ہیں۔ اور اس کورانہ تقلید کے نقصانات مشاہدہ کرتے، ہوئے بھی اسی پر اڑے رہتے ہیں۔ اور نتیجہ کفر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس اندھی تقلید کی (جو کفر تک پہنچاتی ہے) ایک مثال بیان کرتا ہے

سورۃ بقرہ پارہ ۲ رکوع ۲۲ آیۃ ۱۷۲

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر اختیار کیا ایک ایسے شخص کی مثال ہے۔ جو اسے آواز دیتا ہو۔ جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا بہرے، گونگے اور اندھے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پس وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

تشریحی نوٹ:۔ اس رکوع کی ابتداء تو اس حقیقت کے اظہار سے کی گئی

بھی کہ حرام اغذیہ انسان کی اخلاقی حالتوں کو خراب کر دیتی ہیں اور شیطانی اعمال کو ترغیب دلاتی ہیں بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوگی لیکن طبی تحقیقات اغذیہ کے اثرات پر کافی روشنی ڈال رہی ہیں اور اخلاقیات اور نفسیات کے ماہرین نے غذاؤں کے متعلق اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا ہے کہ غذائیں اخلاقیات پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور اس طرح یہ قرآن کریم کی تعلیم کی صداقت کا ایک بین ثبوت ملتا ہے۔ ایسے لوگ جو حلال و حرام اور خبیث و طیب میں فرق نہیں کرتے۔ وہ مختلف قسم کے اخلاقی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور انکی غور و فکر کی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اس لئے قبول حق میں جو چیز ان کی راہ میں روک اور ٹھوکر کا باعث ہو جاتی ہے، وہ

کورانہ تقلید آباء ہے

اور اسی کی مذمت یہاں ایک مثال کے رنگ میں کی ہے اس آیت سے پہلی آیت میں فرمایا

"اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت کی اتباع کرو تو جواباً کہتے ہیں نہیں ہم تو اسی طرز عمل کی پیروی کریں گے۔ جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا اور خواہ ان کے بڑے بوڑھے عقل سے کام نہ لینے والے اور ہدایت سے محروم ہی ہوں۔"

اس سلسلہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ عقل و فکر کا صحیح استعمال ایک بصیرت افروز ایمان پیدا کرتا ہے یا یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا قبول ہی عقل اور فکر کا صحیح استعمال ہے یہ تو ایمان کا خاصہ ہے

برخلاف اس کے اندھی تقلید ان قوتوں کو زایل کرکے ہدایت سے محروم کر دیتی ہے اور اس حقیقت کو اس مثال سے واضح کیا کہ جو لوگ ان قوتوں سے کام نہیں لیتے اور ایمان نہیں لاتے وہ چارپایوں کی مانند ہیں اس لئے کہ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز تو عقل ہی ہے۔ جب وہ اس سے کام نہیں لیتا تو وہ حیوان سے آگے نہیں۔

آواز دینے والا کون ہے

قرآن کریم کی زبان (عربی) اپنے اندر بے شمار خصوصیات رکھتی ہے یہاں کافروں کی مثال اس چرواہے کے رنگ میں پیش کی ہے (نقل چرواہے کی آواز پر بولا جاتا ہے) جو اپنے ریوڑ کو بلاتا ہے۔ یہاں قرآن کریم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اس مثال میں اشارہ کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر حیثیت سے داعی بھی ہیں اور قرآن کریم نے ان لوگوں کو جو عقل سے کام نہیں لیتے شرالدواب قرار دیا ہے (سورۃ الانفال آیۃ ۲۲)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب جانوروں سے بدتر وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"

غرض اس مثال میں کورانہ تقلید سے بچنے اور عقل و فکر سے کام لینے کی ہدایت کی ہے۔ اور کفر کو کورانہ تقلید اور بے بصیرتی کا ذریعہ ٹھیرایا ہے۔

---

(۱۰) مکذبین آیات اللہ کی مثال

قرآن کریم پارہ ۹ سورۃ الاعراف رکوع ۲۲ آیت ۱۷۷ میں ایک مثال مکذبین آیات اللہ کی بیان فرماتا ہے مگر اس مثال کو سمجھنے کے لئے اس کی پہلی دو آیات پر غور کرنا ضروری ہے اس لئے میں آیۃ ۱۷۶،۱۷۵ ہی سے شروع کرتا ہوں

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ
مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى
الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ
اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَا
قْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلًا
ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ:- اور (اے نبی) ان لوگوں پر اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسکو ہم نے اپنی نشانیاں (آیات) دیں اور وہ ان آیات سے نکل گیا۔ (یعنے اس پر غور و فکر نہ کیا) تب شیطان نے اسے پا لیا (اپنا شکار سمجھا) اور وہ شخص (اس کی اتباع سے) گمراہ ہو گیا ۱۷۶

اور اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعہ اس کو بلند مرتبہ دیتے لیکن وہ تو زمین کی طرف جھک گیا۔ اور اپنی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی مثال ہے۔ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپتا اور زبان نکالتا ہے اور تو چھوڑ دے تب بھی ہانپتا ہے ۔۔۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی پس یہ حال بیان کر دے تاکہ وہ فکر کریں۔ ۱۷۶"

تشریحی نوٹ

اس مثال میں مکذبین کی مثال کتے سے دی ہے لیکن غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ وہ شخص کون ہے جس کا ذکر آیت ۱۷۶ میں کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا حال پڑھ کر سنا۔ تفاسیر میں مختلف بیانات ہیں۔ اور بعض نام دیئے گئے ہیں میرا مسلک بالکل الگ ہے میں قرآن کریم کو

زیر مثال کون ہے

ایک ابدی اور غیر فانی ہدایت (زندہ کتاب) یقین کرتا ہوں۔ اس لئے میں اس طرف نہیں جاتا کہ یہ زید تھا یا بکر قرآن کریم ایک عام اصل بیان کرتا ہے کوئی خاص شخص اس کے مد نظر نہیں۔ یہ الگ امر ہے کہ کوئی خاص شخص عملاً بھی اس کا مصداق ہوا ہو۔ یہ ایک عام مثال ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ

مکذبین حق کا حال بیان کرتا ہے

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ تکذیب آیات اللہ کن برے نتائج کو پیدا کرتی ہے اور ایسے انسان کو انسانیت سے نکال کر کتے کی صورت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

میں جب اسے عام قرار دیتا ہوں تو محض اپنے تخیل سے نہیں

میں تو انہی آیات میں اس حقیقت کو نمایاں پاتا ہوں دیکھو خود قرآن کریم فرماتا ہے

ذالک مثل الذین کذبوا بہ ایاتنا

یہ مثال جو اتل علیہم سے شروع ہوئی ہے۔ ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ایات اللہ کی تکذیب کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو بھی آیات اللہ کی تکذیب کرتا ہے اسکی حالت یہ ہوتی ہے۔

آیات اللہ پر غور کرنیکا نتیجہ

اس آیت میں اس اصل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ جو شخص ایات اللہ پر غور نہیں کرتا اور ان سے اعراض کرتا ہے وہ شیطان کے قابو میں آجاتا ہے اور اس کا نتیجہ بجز گمراہی کے اور کیا ہوگا۔ آگے فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو اس کا رفع کر دیتے۔ مگر وہ تو زمینی ہو گیا۔

رفع اور اخلد الی الارض کی حقیقت

اس مثال میں لفظ رفع کی حقیقت بھی بیان کر دی ہے بعض نادان جو قرآن کریم کے الفاظ پر وسعت نظر نہیں رکھتے وہ اپنی کوتاہ نظری سے رفع کی اصل حقیقت (روحانی رفع ہے) کو چھوڑ کر رفع الی السماء (جو قرآن کریم میں نہیں) قرار دے لیتے ہیں یہاں رفع کے بالمقابل اخلد الی الارض کے الفاظ کو رکھ کر بتا دیا ہے کہ اس سے مراد روحانی مراتب کا صعود یا زمینی حالت کا اختیار کر لینا ہے۔

انسان کو اللہ تعالٰے نے احسن تقویم میں پیدا کیا ہے یعنے اس میں ایسی قوتیں اور استعدادیں رکھی ہیں کہ وہ قرب الٰہی کے مدارج کو حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ ان طریقوں کو ترک کر دیتا ہے۔ تو

بجائے آسمانی ہونے کے زمینی بن جاتا ہے۔

لوشئنا کے معنے

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا بھی غلط مفہوم لیا جاتا ہے اور ایک شخص اپنے جرائم کے لئے یہ عذر تراش لیتا ہے کہ اگر خدا چاہتا یہ حصہ آیت اس راز کو کھول رہا ہے یعنے ہماری مشیت تو یہی تھی کہ اس کے مقام قرب کے لئے رفع کرتے مگر وہ تو زمینی خواہشوں میں گھر گیا اس لئے اس کا رفع نہ ہو سکا۔

بصیرت

اس میں یہ سبق دیا ہے کہ جو شخص اپنی نفسانی خواہشوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ وہ مراتب قرب کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اسکی مثال کتے کی سی ہو جاتی ہے۔

خلاصۃ الکلام

غرض اس مثال میں مکذبین آیات اللہ کی حقیقت کو بیان کیا ہے ایسے لوگ بجائے ایسے اعمال کے جو اسکے رفع کا ذریعہ بنتے اپنی نفسانی اور شہوانی خواہشات کے غلام ہو جاتے ہیں۔ اور جس طرح کتا ہر حالت میں ہانپتا اور زبان نکالتا ہے ان کی بھی یہی حالت ہو جاتی ہے وہ سراسر ایک زمینی بن جاتے ہیں۔ اور اطمینان قلب سے بے نصیب ہو جاتے ہیں اس لئے کہ سکینت اور اطمینان تو ذکر اللہ سے حاصل ہوتا ہے اور وہ ایمان کا نتیجہ ہے کہ تکذیب کا۔

اس سارے رکوع کو پڑھنے سے ہدایت اور غوایت کے اسباب اور نتائج کا پورا پتہ چلتا ہے۔ اور ایسے لوگ جو آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں وہ کالانعام ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ پس یہ کسی خاص

شخص کی مثال نہیں بلکہ ہر وہ آدمی جو آیات اللہ کی تکذیب کرتا ہے انسانیت کے مقام رفیع سے گر جاتا ہے اور شیطان ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام ہو کر اپنے مقام انسانیت سے گر کر

ایک کتے کی مثال ہو جاتا ہے

اور خود اسی مقام پر اللہ تعالےٰ اس کو بدترین مثال قرار دیتا ہے آیۃ ۱۷۸

سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ ۝

کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور آپ ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔

(۱۱) انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کی مثال

قرآن کریم اور مناظر قدرت

قرآن کریم اپنے اسلوب بیان میں ایک ممتاز اور بے مثل رنگ رکھتا ہے میں نے البیان فی اسلوب القرآن میں قرآن مجید کے بعض اسالیب بیان کا مختصر ذکر کیا ہے یہاں انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کی مثال بیان کرنے سے پہلے اتنا بیان ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم اپنی تعلیمات کو نہ صرف دلائل عقلیہ سے ثابت کرتا ہے بلکہ مناظر قدرت اور مشاہدات صحیحہ کے رنگ میں بھی اسکی حقیقت کو واضح کرتا ہے اس سے مقصد صرف اس تعلیم کی صحت اور کمال کا اظہار ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ علم و فکر کی قوتوں کو نشو و نما دینا ہے اور انسان کے اندر جو مختلف قسم کی استعدادیں ہیں انکو محرک کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ جو مثال میں اب پیش کرتا ہوں وہ ایسے لوگوں کی مثال ہے جو انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ تکمیل ایمان و اعمال صالحہ کا ذریعہ ہے

بہت تھوڑے لوگ ہیں جو اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ ایمان اور اعمال صالحہ کی تکمیل انفاق فی سبیل اللہ کے بغیر نہیں ہو سکتی اور سچ تو یہ ہے۔ کہ اعمال صالحہ کا جزو اعظم اسی پر موقوف ہے۔ خود انسان کے اپنے بقائے

نفس اور بقائے نوع کے لئے کسب حلال کے ذریعہ حصول مال کی ضرورت ہے۔ پھر حج۔ زکوٰۃ۔ نکاح۔ طلاق یتامیٰ ومساکین کی خبر گیری اقارب سے سلوک ایک لمبا سلسلہ اعمال کا ہے جو انفاق کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا مسئلہ انفاق کے مختلف پہلوؤں پر میں نے اپنی کتاب الزکوٰۃ میں بھی بحث کی ہے لیکن میری اس زیر تالیف کتاب امثال القرآن میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال بلکہ مثالیں قرآن کریم سورۃ بقرہ رکوع ۳۵ میں بیان کی ہیں اس لئے میں اس مقام پر اس پورے رکوع کی تفسیر اپنی کتاب تفسیر القرآن سورۃ بقرہ سے درج کر دیتا ہوں

رکوع کا خلاصہ انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور یوں شفقت علی خلق اللہ کی ہدایت اور ترغیب دیکر بتایا جاتا ہے کہ کس طرح پر انسان خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے اپنے مال کو بڑھا سکتا ہے اور اس مثال کی تہ میں خرچ کرنے کی ایک اصل سکھائی جاتی ہے۔ حقیقی خیرات جس میں احسان یا تکلیف نہ ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑے اجر کا باعث ٹھیرتی ہے اور انسان کو ہموم وغموم سے نجات دینے کا موجب ہو جاتی ہے۔ سائل کی دلجوئی اور اس کے اصرار پر صبر کی ہدایت کر کے حقیقی نیکی کا سبق دیا جاتا ہے اور سکھایا جاتا ہے کہ احسان نمائی ایذادہی نمود ونمائش صدقات کے اجر کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے منکر ہیں۔

کامیابی اور ناکامی کی ایک اور اصل بتائی جاتی ہے۔ محض خدا تعالےٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کرنے والوں کی ایک اور مثال دی جاتی۔ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے صدقات افزونی مال کا باعث ہوتے ہیں۔ اور محض خدا کیلئے نیکی کرنیکی ایک راہ سکھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال کا بدلہ دینے والا یقین کر دے آخر میں بتایا ہے کہ کس طرح پر انسانی فطرت آرام اور کامیابی چاہتی

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی سی ہے جو سات بالیاں اگائے اور ہر بالی میں سو دانے اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے بڑھاتا ہے اور اللہ وسیع کرنے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر پہلے انفاق فی سبیل اللہ کے لئے عام طور پر ترغیب دی تھی کیونکہ کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کون ہے جو اللہ کے لئے اپنے مال کا ایک حصہ قرض حسنہ کے طور پر الگ کر دے۔ اور پھر حکم دیا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ ایمان والو جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ بھی کرو۔ اب طبعی طور پر اس حکم پر سوال ہو سکتا تھا کہ کیوں خرچ کریں۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا ہے بظاہر تو یہی ہو گا کہ مال کم ہو جاوے گا۔ اس کا جواب اللہ تعالےٰ دیتا ہے اور گویا وجہ

بتا کر اس وہم کا ازالہ کرتا ہے کہ مال کم نہیں ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے والا سات سو گنا تک نفع اٹھا سکتا ہے جیسے ایک دانہ زمین میں ڈال دیا جاتا ہے پھر اسکی بالیاں نکلتی ہیں اور ایک دانہ کتنے، دانوں کا مجموعہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پر جو چیز اللہ تعالیٰ کے سپرد کی جاوے اور اس کی راہ میں خرچ کی جاوے۔ وہ کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کے معنی دوچند کرنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ مضاعفت کے معنے بڑھانے کے ہیں خواہ وہ کئی گنا ہوں خیرات کیا ہوا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا ہوا کیوں بڑھتا ہے اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علیم ہے اس کی صفات کے تقاضے تو بہرحال پورے ہو کر رہتے ہیں جب کہ اسکی صفت یہ ہے تو پھر کیوں اسکی راہ میں دیا ہوا مضاعف نہ ہو۔

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کے معنے کرنے میں لِمَنْ يَّشَآءُ سے مراد وہی شخص ہے جس کا ذکر پہلے اللہ تعالیٰ یوں فرما چکا ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے مال کا ایک حصہ الگ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسکو ضرور بڑھاتا ہے

پھر انسان جس سچی خوشحالی اور راحت کا فطرتاً طلب گار ہے وہ نہ مال سے حاصل ہو سکتی ہے نہ علم سے اور نہ کسی اور چیز سے بلکہ سچی خوشحالی اور راحت کا ملنا اللہ تعالیٰ ہی کے فضل پر موقوف ہے

مگر اللہ تعالیٰ کے نفس کے لئے بعض امور بطور جاذب فضل ہو جاتے ہیں۔

ان میں سے انفاق فی سبیل اللہ بھی ہے چنانچہ فرماتا ہے

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّہُمْ اَجْرُہُمْ عِنْدَ رَبِّہِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

ترجمہ: جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر جو کچھ خرچ کیا ہے۔ اس کے بعد کوئی احسان نہیں جتاتے اور نہ دل آزاری کرتے ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر اگرچہ کہ قرینہ کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ جہاد کی تقریب ہے لیکن جبکہ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ تکمیل ایمان کے لئے ضروری ہے تو کیوں ہم عام انفاق فی سبیل اللہ اس سے مراد نہ لیں۔ اور اس اگلے رکوع پر تدبر کرنے سے صاف طور پر یہ عمومیت سمجھ میں آجاتی ہے جیسا کہ ابھی آتا ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ وَالْاَذٰی اپنے صدقات کو منت رکھنے اور دل آزاری سے باطل نہ کرو یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا کیلئے خرچ کرتے ہیں وغیرہ

اصل بات یہ ہے کہ اسلام عام احسان اور ہمدردی نوع انسان کی تعلیم دیتا ہے اور اس کا بہت بڑا ذریعہ خرچ مال ہے۔

اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کا ایک دوسرا نتیجہ بتایا گیا ہے

اور وہ ہے اجرہم عند ربہم ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون
ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف اور حزن نہیں ہے۔
اس سے پہلی آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کا نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ اس وہم کا ازالہ کر دیا تھا جو بشریت کے ضعف سے کمی مال کا پیدا ہوتا تھا۔ اور مثال دیکر سمجھایا تھا کہ جیسے زمیندار ایک دانہ زمین میں ڈالتا ہے اور بظاہر وہ دانہ ضائع ہو گیا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ محض اس لئے کہ خدا تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کر کے ڈال دیا جاتا ہے تو کئی گنا پھل لاتا ہے لیکن اس آیۃ میں بہت بڑی ترقی دکھائی ہے۔

اجرہم عند ربہم

یہاں اَجْرُہُمْ عِنْدَ رَبِّہِمْ جو فرمایا ہے یہ بہت ہی قابل غور حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو کیوں لیا؟ یاد رہے کہ رب ان اسماء الٰہی میں سے ہے جو انسان کی فطری ضروریات اور سچی خواہشات کے متکفل ہیں اور نظام عالم کا انحصار ان پر ہے۔

ربوبیت کا فیضان فیضان اعم ہے یہ وہ فیضان مطلق ہے کہ جو بلا تمیز ذی روح وغیر ذی روح افلاک سے لے کر خاک تک تمام چیزوں پر علی الاتصال جاری ہے اور ایک چیز کا عدم سے صورت وجود پکڑنا اور پھر وجود کا حد کمال تک پہنچنا اسی فیضان کے ذریعہ سے ہے۔ اور کوئی چیز جاندار ہو یا غیر جاندار اس سے باہر نہیں اسی سے وجود تمام ارواح واجسام کا ظہور پذیر ہوا اور ہوتا ہے اور ہر ایک چیز نے پرورش پائی اور پاتی ہے یہی فیضان تمام کائنات کی جان ہے اگر وہ ایک لمحہ منقطع

ہوجاوے تو تمام عالم نابود ہو جاوے۔

چونکہ یہ ایسا وسیع الشان فیضان ہے اس لئے فی سبیل اللہ انفاق کرانے والے کے اجر کو اس کے نیچے رکھا ہے یعنی جب اس کا فیضان اعم ہو جو بلا درخواست بلا تمیز کافر و مومن وغیرہ انسان کی فطرتی ضرورتوں کا متکفل ہے تو اس صفت کے ماتحت جو اجر ملے گا وہ کس قدر بڑھ کر ہو گا یہ دوسرا ثبوت اس امر کا ہے مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضعف لمن یشآء واللہ واسع علیم ؛

انفاق فی سبیل اللہ کی صورت

انفاق فی سبیل اللہ کس صورت میں بار آور یا نتیجہ خیز ہو سکتا ہے؟ اسکی صورت اس آیت میں بتائی ہے اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى یعنے اللہ تعالے کی راہ میں خالصۃً للہ خرچ کرنے کی یہی صورت ہے کہ خرچ کر کے کوئی احسان نہ جتایا جائے یا تکلیف نہ دی جائے۔

اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب کسی کے ساتھ کوئی سلوک کرتے ہیں پھر اس سلوک کا بار بار بطور احسان اظہار کرتے ہیں یا جس شخص کو دیا ہے اس کو تکلیف دیتے ہیں۔

خدا تعالے کے لئے جو مال خالصۃً خرچ کیا جاوے اسمیں ریا اور نمود و نمائش کی خواہش سلب ہو جاتی ہے پھر وہ صرف مال اضطراب کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ فطرتی جوش اور سرور کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا یہ کہو

محبت ذاتی کے رنگ میں ہو جاتا ہے کسی کی مدح و ذم یا نفع و ضرر غرض نہیں ہوتی یعنی انفاق فی سبیل اللہ اس لئے نہیں کرتے کہ اس سے کوئی نفع مقصود ہے۔ یا ضرر سے بچنا غرض ہے بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اضطراری طور پر کرتے ہیں۔ اگر کوئی ثواب بھی اس پر مترتب ہونے والا نہ ہو یہ وعدے جو ایسے مال کے بڑھنے اور مضاعف ہونے کے اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں نہ بھی ہوں تب بھی وہ خرچ کریں گے ابتغاء مرضات اللہ جب انسان کا مقصود ہوتا ہے تو اس کے تمام اغراض نفسانی جل جاتے ہیں اور دل ایسا محبت سے بھر جاتا ہے جیسا ایک شیشہ عطر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ غرض نفسانی اغراض کا بقیہ اور رائحہ رہتا ہی نہیں۔ ابتغاء مرضات اللہ کے معنے ایک اور آیت سے بھی حل ہوتے ہیں جو اس طرح پر ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ یعنے بعض مومن لوگوں میں سے وہ بھی ہیں کہ اپنی جانیں رضاء الٰہی کے عوض میں بیچ دیتے ہیں۔ اور اللہ اپنے ایسے بندوں پر مہربانی کرتا ہے۔ نفس کے بیچنے میں یہ بات داخل ہے کہ انسان اپنی زندگی اور اپنے آرام کو جلال الٰہی کے ظاہر کرنے اور دین کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (آمین)

اور پھر مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ کی تفسیر ایک اور آیت کر رہی ہے یا یہ کہو کہ یہ اس آیت کی تفسیر ہے اور وہ یہ ہے بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

فَلَهُ اَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

یعنی مسلمان وہ ہے جو اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لیے سونپ دیوے۔ یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کے لئے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیوے یا یہ کہو کہ اعتقادی اور عملی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کا ہو جاوے۔ اور یہ اعتقادی اور عملی صفائی۔ ذاتی محبت پر مبنی ہو اور طبعی جوش سے اعمال حسنہ اس سے صادر ہوں وہی ہے جو عند اللہ مستحق اجر ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے نجات نقد موجود ہے نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ غم

اور ایسا ہی یہ آیت بھی ان معنوں کی تائید اور تصدیق کرتی ہے

یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

یعنی مومن وہ ہیں جو خدا کی محبت سے مسکینوں یتیموں اور قیدیوں کو روٹی کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں اس روٹی کھلانے سے تم سے کوئی بدلا اور شکر گذاری نہیں چاہتے اور نہ ہماری کچھ غرض ہے ان تمام خدمات سے صرف خدا کا چہرہ ہمارا مطلب ہے۔

غرض

جہاں تک قرآن کریم میں تدبر کرو صاف طور پر کھل جاوے گا۔ تُمْنُوْنَ لَا یَتَّبِعُوْنَ مَنًّا وَّلَا اَذًی میں محبت ذاتی کی تعلیم دینا مقصود ہے کہ انفاق کسی غرض وطمع کا نتیجہ نہ ہو جب ایسا ہو گا تو پھر اس کا نتیجہ

فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون ہوگا

سعادۃ نامہ کے مدارج
فنا - بقا - لقا

اوپر کی آیتوں میں مطابقت دکھلاتے ہوئے اس آیت کو بلیٰ من اسلم سے بھی مطابق کیا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ دونوں کے نتائج اور ثمرات ایک ہیں۔

اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور یہ سچ ہے تو کچھ شک نہیں کہ ان دونوں آیتوں میں بہت بڑا تعلق ہے اسلام ایک للّٰہی وقف چاہتا ہے اور یہ آیت بھی ایک للّٰہی وقف کی ہدایت کرتی ہے۔ اس بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ سعادت نامہ کے ہر سہ مراتب ضرور یہ فنا بقا۔ لقا کی تعلیم اس میں موجود ہے۔ ینفقون اموالهم فی سبیل اللہ جو وقف تام مالی کو چاہتا ہے۔ یہ فنا کی حالت پر واقع ہوا ہے۔ کیونکہ جب اپنے مال کو جو علم رؤیا میں کلیجہ دکھایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو اس پر ایک قسم کی موت ہی وارد ہو جاتی ہے اور پھر ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی کا فقرہ بقا کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس میں تمام نفسانی جذبات کو سلب کرکے رضات اللہ میں ایک زندگی پاتا ہے اور گویا ربانی تحریک سے پر ہو کر حرکت کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جو بقا کہلاتا ہے۔

پھر بعد اس کے یہ فقرات لهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون جو اثبات وایجاب اجر و نفی وسلب وخوف وحزن پر دلالت کرتے ہیں یہ حالت لقا کی طرف اشارہ کرتا ہے

کیوں کہ جس وقت انسان کو عرفان اور یقین اور توکل اور محبت میں ایسا مرتبہ عالی پیدا ہو جاوے کہ اس کے خلوص اور ایمان اور وفا کا اجر اس کی نظر میں وہمی اور خیالی اور ظنی نہ رہے۔ بلکہ ایسا یقینی اور قطعی اور مشہود اور محسوس اور مرئی ہو کہ گویا وہ اس کو مل چکا ہے اور ہر ایک آیندہ کا خوف اسکی نظر سے اٹھ جاوے اور ہر ایک گذشتہ اور موجودہ غم کا نام و نشان نہ رہے اور ہر ایک روحانی تنعم موجود اس وقت نظر آوے تو یہی حالت جو ہر ایک قبض اور کدورۃ سے پاک اور ہر ایک شک و دغدغہ سے محفوظ اور ہر ایک درد انتظار سے منزہ ہے لقاء کے نام سے موسوم ہے۔

غرض

یہ انفاق فی سبیل اللہ ایسا ہونا چاہئے۔ اگر انفاق فی سبیل اللہ کی مقدرت نہ ہو یا ان صفات کے ساتھ نہ ہو تو پھر

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○

ترجمہ:۔ بھلی بات کہنی اور پردہ پوشی کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد دکھ دیا جاوے اور اللہ تعالیٰ غنی اور حلیم ہے۔

تفسیر یاد رکھو جب سائل سوال کرتا ہے اس وقت سائل اور مسئول عنہ کی دو حالتیں ہوتی ہیں یا تو اس کے پاس ہی نہیں ہے اور یا بخیل ہے اور دیتا نہیں اس طرح یہ گویا چار باتیں ہوئیں سائل کی نسبت

اگر نادار غریب ہے تو گویا ذلیل ہے۔ اور یہ سوال اسکی پردہ دری کا باعث ہے۔ اس لئے یہاں ہدایت ہے قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ یعنے جب کوئی سوال کرے تو سایل کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی مغفرت طلب کرو کہ اللہ تعالیٰ اس سوال کی ذلت سے بچائے اور اچھی بات بھی کہدو۔ اور استغفار بھی کرو۔ یہ اس صدقہ سے بہتر ہے کہ جس میں اذی اور تکلیف ہو۔ ہمارے ملک میں یہ دستور ہے کہ جب سایل کچھ مانگتا ہے اور اس کو کچھ دینا نہیں ہوتا ہے تو کہدیتے ہیں کہ معاف کرو۔ اصل میں قرآن شریف کی اس آیت کا مفہوم اور منشا یہ ہے کہ اپنے لئے اور سایل کے لئے خدا سے حفاظت چاہو اور دل آزار باتیں نہ کرو جو پردہ دری کا موجب ہوتے ہیں۔

اب پھر اللہ تعالےٰ انفاق فی سبیل اللہ کی مزید تحریک فرماتا اور خالصۃً للہ انفاق کی صورت بتاتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ:۔ ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتلانے یا ایذا رسانی سے اس شخص کی طرح اکارت نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے صرف کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ اور یوم آخرہ پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال اس چکنے پتھر کی سی ہے

جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برسے تو اس کو صاف سل بنا چھوڑ دے۔ جو کچھ انہوں نے کمایا اس میں سے وہ کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتے اور کافر جو کام کر رہے ہیں وہ اللہ تعالے کے بتائے ہوئے نہیں یا اللہ تعالے کافروں کو بامراد نہیں کرتا۔

پھر ان لوگوں کی مثال دیتا ہے جو محض خدا کیلئے اپنا مال خرچ کرتے ہیں

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ:۔ اور جو لوگ اپنے مال خوشنودی خدا کی طلب میں اور اپنی ثبات خاطر سے خرچ کرتے ہیں انکی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ اونچے اور سرسبز خیز زمین میں ہو اور اس پر زور کا مینہ برسے پس وہ اپنا پھل دوچند دے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو اسکو شبنم ہی کافی ہے اور اللہ تعالٰی اعمال کا نگران ہے۔

تفسیر یہ مثال اللہ تعالٰی نے ان لوگوں کی دی ہے جو اپنے مال کو محض رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرتے ہیں اور پہلی مثال ان لوگوں کی تھی جو ریا ء اور اذی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اب بطور سائل کے سوال کرتا ہے

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ:- کیا تم میں سے کوئی ایک پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس کے نیچے سے نہریں جاری ہوں۔ اس میں ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور وہ شخص بوڑھا ہو جاوے۔ اور اولاد اس کی کمزور ہو۔ پھر اس باغ پر بادصرصر (جلا دینے والی) کا ایک بگولا چلے جس میں آگ ہو پس وہ باغ جل جائے۔ اس طرح پر اللہ تعالےٰ تمہارے لئے نشان بیان کرتا ہے۔ تاکہ تم فکر کرو۔

تفسیر ان مثالوں میں اللہ تعالےٰ انفاق فی سبیل اللہ کے مختلف مدارج اور ان کے نتائج کو بیان کرتا ہے۔ پہلی مثال ان لوگوں کی ہے جو ریاء الناس کے لئے خرچ کرتے ہیں دوسری مثال رضائے الٰہی کے خرچ کرنے والوں کی ہے اور یہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آئندہ کامیابیوں کی پیشگوئی ہے۔ آخری آیتوں میں دونوں مثالوں کو پیش کر کے سمجھایا ہے کہ ریاء الناس کے لئے خرچ کرنا گویا اعمال صالحہ متعلقہ انفاق کو ضایع کرنا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس سے ہم کو اور ہمارے پڑھنے والوں کو بچائے۔ آمین

(۱۲) حیات الدنیا کیلئے خرچ کرنیوالوں کی مثال

اوپر کی مثال ان لوگوں کی تھی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس گروہ کے مقابل ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنکی ساری تگ و دو اس دنیا کی آسایش و آرایش تک ہوتی ہے وہ اپنے اموال نفسانی شہوات کے لئے خرچ کرتے ہیں اور حق و صداقت کے مقابلہ میں بھی بڑھکر حصہ لیتے ہیں ان کا مقصد تخریب اسلام ہوتا ہے فی سبیل اللہ خرچ کرنے والے کا مقصد تعمیر ہوتا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے آخر الذکر لوگوں کے اعمال کے ثمرات کا ذکر اس دانے کی مثال سے کیا جو بویا جاوے اسی طرح حیات الدنیا کے خرچ کرنے والوں کی مثال دیتا ہے فرمایا سورۃ آل عمران پارہ ۴ رکوع ۱۲ آیۃ ۱۱۷

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال و دولت کو اس دنیا کی زندگی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ ایسی ہوا کی ہے جس میں سردی ہو۔ اور وہ سخت سردی (یا لا) والی ہو۔ ان لوگوں کی کھیتی پر گذرے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ یعنے وہ ہوا

سے تباہ کر دے۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ آپ ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

تشریحی نوٹ اس آیت سے پہلی آیۃ میں بتایا تھا کہ جو لوگ اپنے مال و اولاد کی کثرت اور جمعیت پر بھروسہ کر کے حق کی مخالفت کرتے ہیں وہ ان کوششوں میں نہ صرف ناکام ہوں گے بلکہ اللہ تعالےٰ کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ مثال انکی کوششوں کی ناکامی ونامرادی کی ہے اور اپنے اندر ایک پیشگوئی کا رنگ رکھتی ہے۔ جس طرح پر فی سبیل اللہ خرچ کرنے والوں کی مثال ایک دانے سے دی تھی اور زرعی رنگ میں اس کے نتائج پیش کئے تھے یہاں بھی کھیتی ہی کی مثال دی ہے۔ اور دنیا آخرۃ کی کھیتی ہے (الدنیا مزرعۃ الآخرۃ)

ان کی مثال اس کسان کی ہے جس نے بڑی محنت ومشقت سے اپنا کھیت تیار کیا ہو پھر سخت سرد ہوا جسے پالا کہتے ہیں اسے تباہ کر دے اور وہ ہاتھ ملتا ہوا رہ جائے۔

حیات الدنیا کے لئے اخراجات مختلف قسم کی شہوات نفسانی پر ہوتے ہیں اور چونکہ یہ شیطانی افعال ہوتے ہیں اور شیطان دشمن صداقت ہے اس لئے وہ حق کے مقابلہ میں بھی خرچ کرتے ہیں مگر

نتیجہ حسرت وندامت کے ساتھ ناکامی ہوتا ہے

(۱۳) اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مثال

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کی مثال قرآن مجید نے تورات وانجیل کی پیشگوئیوں کے موافق بیان کی ہے۔

سورۃ الفتح پارہ ۲۶ آخری رکوع آخری آیۃ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۭ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَی
الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَیْنَہُمْ تَرٰىہُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا
یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ۡ سِیْمَاہُمْ
فِیْ وُجُوْہِہِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُہُمْ
فِی التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُہُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ كَزَرْعٍ
اَخْرَجَ شَطْـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى
عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِہِمُ الْكُفَّارَ ۭ
وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنْہُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو اس کے ساتھ ہیں (ان کی صفات یہ ہیں کہ) وہ کافروں کے مقابلہ میں قوی ہیں (مرعوب نہیں ہوتے) اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں۔ تو انہیں رکوع کرتے ہوئے اور سجدہ

کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہ اپنے رب کے فضل اور اسکی رضا کے طلبگار ہیں۔
ان کے علامات ان کے چہروں پر سجدہ کے نشانوں سے ظاہر ہیں
یہ ان کی مثال توریت میں ہے اور انجیل میں انکی مثال کھیتی کی مثال
ہے۔ جو اپنی سوئی کو نکالتی ہے پھر اسے مضبوط کرتی ہے پھر اپنی قانون پر
سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ جو کھیتی کرنے والوں کو خوش کرتی ہے ـــ
تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو غضب میں لائے۔

اللہ تعالےٰ نے مومنوں اور اعمال صالحہ بجالانے والوں سے وعدہ کیا
ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ اور اجر عظیم دیگا۔

تشریعی نوٹ اس آیتہ سے پہلے غلبہ اسلام کی پیشگوئی کیگئی ہے اور بتایا
گیا ہے کہ یہ غلبہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی،
نبوۃ ورسالت سے وابستہ ہے اور ایک دائمی وعدہ ہے کہ ادیان باطلہ
کے مقابلہ میں اسلام کی جیش کی ہوئی ہدایت اور صداقت غالب آئے گی۔
اور یہ غلبہ ہر زمانہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت ورسالت
کا ایک بیّن ثبوت ہوگا۔

اشداء علی الکفار کے معنی دوسرا عملی ثبوت آپ کی رسالت ونبوۃ کا وہ جماعت ہے
جو آپ کی قوت قدسی کے اثر وتربیت سے پیدا ہوئی ہے
جو صحابہ کی جماعت ہے ان کے دو اساسی اوصاف ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ،
اشداء علی الکفار ہیں اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ کافروں پر سختی
کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کافروں کے مقابلہ میں قوی اور مضبوطی سے مقابلہ

کرنے والے ہیں وہ کافر کی ہر جبتی قوت سے مرعوب نہیں ہوتے اور نہ ان کے عقائد ان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

قرآن کریم اس مفہوم کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر یہ فرماتا ہے

سورۃ مایدہ پارہ ۶ رکوع ۸ آیۃ ۵۵

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

مومنوں کے مقابلہ میں نرم اور کافروں کے مقابلہ میں غالب

اعزہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی وہ حالت جبکہ وہ مغلوب نہ ہو بلکہ غالب ہو۔

کامیابی کے دو گر

دراصل اس مقام پر اللہ تعالےٰ نے غلبہ اسلام کے لئے دو گُر بتائے ہیں اور یہ اساسی طور پر ہیں اول یہ کہ جماعت میں باہم ایک دوسرے سے محبت اور نرمی کا سلوک ہو اور اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بڑھ کر نہ سمجھے اور نہ دوسرے کو ذلیل بلکہ ہر ایک دوسرے کو ممتاز یقین کرے اس عمل سے باہم محبت واتحاد پیدا ہوگا دوم جب کفار سے مقابلہ ہو تو ان سے مرعوب نہ ہو اور پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ ڈٹا رہے اور یہی قانون ہر قسم کی ترقیات سے وابستہ ہے۔ الٰہی سلسلوں میں اندرونی تنظیم بنیان مرصوص کی طرح ہو۔ اور اسی سے وہ قوت مقابلہ پیدا ہوتی ہے جو دشمن سے مرعوب نہیں ہونے دیتی اور یہاں اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوت قدسی کے اثرات کو پیش کیا ہے کہ اس نے ایسی جماعت تیار کر دی جو باہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور کفار کے مقابلہ میں ان کی

کثرت و قوت سے مرعوب نہیں ہوتے۔

اعمال صحابہ

اس کے بعد اس تربیت یافتہ نبوی جماعت کے اعمال کا ذکر کیا ہے اور ان کے عملی صفات کا ذکر فرمایا

(۱) وہ رکوع و سجود میں مصروف ہیں یعنے احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمیشہ جھکے ہوئے (رکعاً) اور سر بسجود ہیں۔ یہ کامل فرماں برداری کا نشان ہے اور ان کی غرض اس انقیاد و اطاعت سے

محض رضائے الٰہی ہے۔

(۲) انکی کامل فرماں برداری کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہیں یہاں اس سے مراد وہ گٹے نہیں جو بعض لوگوں کے چہرہ پر سجدہ کی وجہ سے پڑ جاتے ہیں بلکہ یہ نشان وہ نور ہے جو ان کو دیا جاتا ہے اور جو ان کے تمام اعمال میں حسنات پیدا کرتا ہے قرآن کریم پارہ ۳۰ سورۃ التطفیف میں فرمایا تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ۝

تو ان کے چہروں پر نعمتوں کی تازگی کو مشاہدہ کرے گا۔

غرض یہ وہ نشان ان کے چہروں پر ہے جو ان کے حسن اعمال کا نتیجہ ہے اور ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"جو شخص رات کو تہجد کی بہت نماز پڑھتا ہے اس کا منہ دن کو بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔

ایک شہادت

مکرم خواجہ حسن نظامی صاحب سے میرے بہت پرانے مراسم ہیں۔ اور آج ان پر ۴۷ برس گذرتے ہیں باوجود اختلاف کے اخلاقی مراسم

ہم میں کبھی کم نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ وہ حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور الہ دین بلڈنگ میں بھی آئے اور حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین سلمہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھا مجھے دوسرے دن جب میں ان سے ملنے گیا تو کہا کہ اس شخص کے چہرہ پر میں نے جو نور دیکھا ہے وہ تہجد گذار اور شب زندہ دار کا ہی ہو سکتا ہے۔

غرض یہ صحابہ کے صفات بیان کئے ہیں۔ قرآن کریم میں انکے عملی کمالات کا تفصیلی ذکر ہے اور سر ولیم میور نے سورۃ الفرقان کی آخری آیات میں عباد الرحمن کے صفات کے متعلق صاف اقرار کیا ہے کہ یہ اس جماعت صحابہ کے صفات ہیں جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوت قدسی سے اس مقام کو حاصل کیا۔

توراۃ کی مثال

قرآن کریم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انکی مثال توراۃ میں ہے توراۃ نے ان تمام صفات کا نقشہ صرف ایک لفظ قدوسی میں بیان کر دیا ہے اور عجیب بات ہے کہ باوجود ترجمہ در ترجمہ ہونے کے یہ لفظ اب تک موجود ہے۔

میں نے ترجمۃ القرآن کے پارہ ۲۶ کی تفسیر میں بڑی بسط سے اس کے متعلق لکھا ہے اس کا مختصر اقتباس یہاں بھی دیتا ہوں۔

فتح مکہ کے دن جو اسلام کی ولادت اور معاً پر قوت جوانی کا دن تھا دس ہزار صحابہ کے ساتھ حضرت خلیفۃ اللہ آدم صفی اللہ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ مثیل موسیٰ بشارت عیسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہم السلام) مکہ میں داخل ہوئے یہ دس ہزار کا عدد اس وقت خدا کے علم و قدرت کا ظہور اور خدا تعالیٰ

توریت کی عظیم الشان پیش گوئی صحابہ کے وجود میں پوری ہوئی

کے قدیمی وعدوں کے پورا ہونے کا نشان تھا چنانچہ توریت کی کتاب استثنا باب ۳۳ درس ۲ میں لکھا ہے۔ "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی" اسی کے موافق وہ حدیث ہے جو حضرت امام بخاری (رضی اللہ عنہ) نے غزوہ فتح کی نسبت نقل فرمائی ہے اور وہ یہ ہے عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خرج فی رمضان من المدینۃ ومعہ عشرۃ آلاف وذٰلک علی راس ثمان سنین ونصف من مقدمہ المدینۃ فسار ھو ومن معہ من المسلمین الی مکۃ" الخ یعنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں مدینہ سے نکلے اور آپ کے ساتھ دس ہزار آدمی تھے اور یہ واقعہ ہجرت کے ساڑھے آٹھ سال بعد واقع ہوا کہ آپ اور آپکی معیت میں مسلمین مدینہ سے مکہ کو روانہ ہوئے۔

توریت کی پیشگوئی اور بخاری کی حدیث کو پڑھ کر جس سے اس پیشگوئی کی تصدیق ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کی ازلی صفات علم وقدرت پر نئے سر سے قوی اور لذیذ ایمان پیدا ہوتا ہے یہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار صحابی ہوئے تو ایک عظیم الشان پیش گوئی پوری ہو جو جناب موسیٰ علیہ السلام کی کتاب

میں لکھی تھی۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے کہ دس ہزار کا عدد آپ کے ساتھ اتفاقی امر تھا ایسا خیال بجز ایسے شخص کے جو سنت نبوی سے جاہل ہے کوئی نہیں کر سکتا حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک واقعہ خدا تعالیٰ نے اگلے سابق وعدوں اور نبوتوں کا موعود واقعہ ہوتا ہے۔ اور قابل توجہ اور بھاری بات ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھیوں کو قدوسی کہنا

صحابہ قدوسی ہیں

یہ خدا تعالیٰ کی صاف ناطق آواز ہے اور خدا تعالیٰ کی آوازیں اور شہادتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں اور وہ اپنے برگزیدوں کے لئے آسمان سے اسی طرح شہادت دیا کرتا ہے۔ میری روح تو ایسے موقعہ پر خدا تعالیٰ کی حمد کرتی ہوئی سجود میں گر جاتی ہے کہ کیا ازلی ابدی مستجمع صفات کاملہ خدا ہے کہ اسکی باتیں پوری ہو کر رہتی ہیں خواہ آسمان و زمین میں کتنے انقلاب پیدا ہوں کیسی عجیب اور حیرت انگیز بات ہے کہ صدیوں پہلے ایک اسرائیلی نبی خدا کی روح سے بولا اور وہ بات لانظیر انقلابوں اور امتحانوں کے بعد فاران کے نور اور مکہ کے فرزند اور اس کے اصحاب کے حق میں پوری ہوئی۔ اگر خدا تعالیٰ کا خاص ارادہ نہ ہوتا اور اس کے فضل سے اس قدر پاک اور قدوسیوں کی جماعت تیار نہ ہو چکی تھی تو کیونکر ممکن تھا کہ آنجناب (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنے عدد کو ساتھ لے کر مکہ میں داخل ہوتے جس کی نسبت پہلے سے پیشگوئی ہو چکی تھی خدا تعالیٰ کا علم اور قدرت یہ ہے کہ نہ آنحضرت کو معلوم ہے اور نہ مسلمانوں کو کہ وہ کیوں ٹھیک دس ہزار کی تعداد کے ساتھ جاتے ہیں اور کیوں اس سے کم یا زیادہ کی کوشش نہ کیگئی مگر یہ سب کچھ اس

مرید مدبر بالا ارادہ ہستی کے قاہر ارادے اور کامل علم سے ہوا۔ تو اس کے منہ کی باتیں پوری ہوں اور اس لئے کہ اس کے قدوسیوں اور برگزیدوں کی عزت کی روشن دلیل ٹھہر جائے جو قریب تھا کہ ایک ظلم عظیم کی طرفدار قوم کی ناپاک باتوں سے ستائے جائیں۔ میں چاہتا ہوں اور صدق دل سے چاہتا ہوں کہ سلیم الفطرت ناظرین اس امر کی طرف پوری توجہ کریں اس لئے کہ یہ آسان اور ناقابل التفات بات نہیں توریت شریف میں ہماری اور شیعوں کی نزاع کا قطعی اور دائمی فیصلہ کر دیا ہے یہ خدائے علیم حکیم کا زبردست ہاتھ تھا کہ ایک مقصد عظیم کے پورا کرنے کے لئے توریت میں اس آیت کو برقرار رکھا حالانکہ ترجموں کی ہزاروں آندھیاں اس پر چلیں اور سینکڑوں الفاظ کے نازک اور نرم پیڑ اکھڑ کر کہیں سے کہیں جا پڑے اور ہزاروں حقایق کے آثار مٹ گئے مگر یہ الفاظ جو خدا کے راستبازوں کی تمجید میں بولے گئے تھے۔

> باوجود ترجمہ در ترجمہ ہونے کے قدوسیوں کا لفظ قایم رہنا خدا کے خاص ارادے کا نشان ہے

ایک اختلاف کے مٹانے کے لئے خدا تعالیٰ کے اذن سے آفتاب و ماہتاب کی طرح قایم اور درخشاں رہے یہ قدوسیوں کا لفظ پیشگوئی کے طور پر بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ ان راستبازوں کو برا کہا جائیگا جو خدا تعالیٰ کے انبیاء کی زبانوں میں مذکور ہوئے اور جو اسلام کے مقصد عظیم یعنی فتح مکہ کے موجب ہوئے اور جن کے وجود سے اسلام کے جوہر نمایاں ہوئے اور جن کے غیر متزلزل اخلاص کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ عزت کے زمانے سے اب تک اور آخر تک ساتھ ہیں اور دوسرا بڑا ثبوت انکی یکرنگ حالت اور کامل اخلاص کا یہ ہے کہ وہ آخر کار ان مبارک وعدوں

کے وارث ہوئے جو کتاب اللہ میں مومنوں کے حق میں دیئے گئے تھے اور خدا تعالیٰ نے انہی کو ملک عظیم بخشا اور انکی عظمت کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ بیت اللہ میں اس پاک اصل کے ظل بنکر فاتحوں کی صورت میں داخل ہوتے ہیں۔

انجیل کی مثال

انجیل میں یہ مثال باغ کے رنگ میں پیش کیگئی ہے اور اس میں کزرع کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ترقی تدریجی ہوگی۔ اور اسی طرح پر ہوا۔ **لیغیظ بہم الکفار** میں اس زمانہ کا ذکر بھی کیا ہے جب مسلمان عملی حالت میں کمزور ہو جائیں گے۔ اور کافر انہیں دیکھ کر غضبناک ہو جائیں گے۔ اور اسی میں اس دوبارہ عروج وجلال کی بھی پیش گوئی ہے۔ جو اس کے بعد آخری حصہ آیت سے ظاہر ہے۔

(۱۴) مچھر کی مثال

سورۃ بقرہ پارہ اول رکوع ۳ آیت ۲۷

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝

اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں رکتا کہ کوئی سی مثال بیان کرے وہ خواہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر۔ پس مومن جانتے ہیں کہ وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور جنہوں نے کفر کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس مثال سے کیا ارادہ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اکثر لوگوں کو اس کے ذریعہ گمراہ قرار دیتا ہے اور اکثر کو ہدایت دیتا ہے۔ اور گمراہ ہونے والے صرف فاسقین (نافرمان ہی) ہوتے ہیں۔

تشریحی نوٹ قرآن کریم میں اس مثال کے متعلق اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بیان کرنے سے نہیں رک سکتا جیسا کہ میں نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکڑی یا مکھی وغیرہ کے امثال سے معبودان باطلہ اور ان کے پرستاروں کے اور نا کامیوں کو ظاہر کیا ہے اور اس

مقام پر اس رکوع میں بھی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ہستی کا اثبات ہے۔
اور مومن اللہ تعالیٰ کی بیان فرمودہ چھوٹی سی چھوٹی بات پر یقین لاتا ہے۔
اور کافر انکار ہی نہیں کرتا من وجہ استھزا کرتا ہے۔ یہ تو خلاصہ مفہوم اس مثال کا ہے

مچھر کی مثال کا پس منظر

میں اسی کتاب میں بیان کر آیا ہوں کہ کسی مطلب کو قریب الفہم کرنے کے لئے مثالوں کی ضرورت ہے اور یہ امر انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اس لئے بیان حقایق کے لئے مثالیں ضروری ہیں اس مقام پر مچھر کی مثال کا ذکر کسی خاص مقصد سے نہیں کیا گیا بلکہ اس امر کو ذہن نشین کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تفہیم کے لئے اگر کسی حقیر سے حقیر چیز کی مثال بھی پیش کی جاوے تو اللہ تعالیٰ اس کے بیان کو ضروری سمجھتا ہے اس لئے کہ اصل مقصد اسکو سمجھانا ہے۔

مچھر کی دنیا

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کسی چیز کو باطل پیدا نہیں کیا اور کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے حکیم و علیم ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ حشرات الارض کے ماہرین نے جو تحقیقاتیں مچھر کے متعلق کی ہیں وہ ایک حیرت انگیز علمی باب ہے۔ اور یہ حقیر سی مخلوق اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک عجیب نمونہ ہے کہ انسان جیسے عالم صغیر کے لئے اپنے حملے سے پریشان کر دیتی ہے۔ انسان بے شک اسے حقیر سمجھتا ہے۔ لیکن اس حقیر مخلوق کے حملوں سے اس کا دم ناک میں آجاتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی قدرت و حکمت کے علاوہ اس اصل کو بتایا ہے کہ کلام الٰہی کے سمجھانے کے لئے وہ کسی مثال کو بیان کرنے سے نہیں رکتا۔

نعمائے جنت کی مثال

اس سے پہلی آیت میں نعمائے جنت کی مثال بیان کی ہے اور یہ بھی قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ نعمائے جنت یا عذاب جہنم کا جو نقشہ بیان کیا گیا ہے یہ تمثیلی رنگ ہے ورنہ جنت کی نعماء تو کسی کے خیال میں نہیں آسکتی ہیں تو اس مثال کی کیا ضرورت اور کیا فائدہ اس قسم کے خیالات کے ابطال کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے ایک قانون کو پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمثیلی رنگ اختیار کرنے سے نہیں رکتا اس لئے کہ تمثیل ایک حد تک اصل کو قریب الفہم کر دیتی ہے۔

اس کی تائید سورۃ المدثر پارہ ۲۹ کی آیۃ ۳۱ سے ہوتی ہے۔ جہاں عذاب النار کی کیفیات کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ایک طریق امتحان ہے۔ مومن تو شک نہیں کرتا مگر جو دل کے مریض ہیں وہ کہتے ہیں

ماذا اراد اللہ بھذا مثلا

وہی الفاظ جو سورۃ بقرہ کے اس بیان میں ہیں یہاں دہرائے گئے ہیں ان دونوں آیات پر غور کرنے سے اس مثال کی حقیقت اور مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

(۱۵) کافر و مومن کی مثال

یوں تو قرآن مجید میں مومن اور کافر کے امتیازات مختلف رنگوں میں بیان کئے ہیں اور ایمان اور کفر کو حیات و موت سے تشبیہ دی ہے مگر یہاں میں ایک مثال کافر اور مومن کی بیان کرنا چاہتا ہوں جو قرآن کریم نے دو عورتوں کے رنگ میں پیش کی ہے۔

کفار کی مثال | پارہ ۲۸ سورۃ تحریم آخری رکوع آیۃ ۱۰

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ○

اور اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوحؑ اور لوطؑ کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے یہ دونوں عورتیں ہمارے صالح بندوں کے ماتحت تھیں پھر انہوں نے خیانت کی اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔ اور کہا گیا کہ تم دونوں آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ ہی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

تشریحی نوٹ | اس آیۃ میں صاف بتایا کہ یہ مثال ہے کفار کی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا ذکر تو صراحتاً قرآن کریم میں نہیں مگر

نوح علیہ السلام کی بیوی کا ذکر اسی آیۃ میں ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومنہ نہ تھیں اور مومن یا مومنہ کے لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ محض نام ہی سے مخلص مومن بن سکتا ہے۔ بلکہ عملی تبدیلی لازمی ہے یہ آیت دراصل ایسے کفار کی ہے جو اگرچہ بظاہر اپنے نبی کے پیرو ہی ہوں لیکن انہیں حقیقت ایمان پیدا نہ ہوئی ہو تو وہ ایمان نہیں گو نہ کفر ہے۔

مثال بالکل واضح ہے کہ وہ دونوں عورتیں اللہ تعالیٰ کے (دو) عباد الصالحین کے ماتحت تھیں مگر انہیں وہ عملی رنگ ایمان کا پیدا نہ ہوا اس لئے وہی سلوک ہوا جو کفار سے ہوتا ہے۔

خیانت سے کیا مراد ہے

یہاں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے خیانت کی۔ خیانت سے مراد نفاق ہے اور منافق کے اعمال میں یہ امر داخل ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرتا ہے البتہ ان دونوں میں کیفیت کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت میں ایک ہی چیز ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منافقانہ رنگ رکھتی تھیں۔ بظاہر ایمانی رنگ کا اظہار کرتی تھیں اور درپردہ حق کی مخالف تھیں۔

اس مثال میں تعلیمی حصہ یہ ہے کہ مومن کامل ہونا چاہیے منافقانہ رنگ منزل مقصود سے ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔

مومن کی مثال

اس آیت سے آگے آیۃ میں مومن مردوں کی مثال دو عورتوں سے دی ہے فرمایا

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ

إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ○ع

اور اللہ تعالیٰ مومنوں کی ایک مثال فرعون کی عورت کی بیان کرتا ہے۔ جس نے کہا اے میرے رب میرے لئے اپنے حضور جنت میں گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دیدے اور مجھے ظالم لوگوں سے بھی نجات دے دے (۱۱)

اور مریم عمران کی بیٹی سے جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا تو ہم نے اسیں اپنا کلام پھونکا اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اسکی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمان برداروں میں سے تھی۔

تشریحی نوٹ پہلی مثال میں مومن کو فرعون کی بی بی سے تشبیہ دی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی بی بی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگہداشت اور تربیت کی۔ بظاہر یہ ایک مثال ایک مومن کے اس مقام کی ہے جو ابھی تک نفس امارہ ہی کے شکنجے میں گرفتار ہے وہ گویا بدیوں کی تحریک کرتا ہے۔ لیکن وہ مومن اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ان اعمال بد سے اور ایسے لوگوں سے جو صادقین نہیں ہیں۔ بچنے

دعائیں کرتا اور اپنے رب کو پکارتا ہے جیسا کہ نجنی من فرعون وعملہ کے الفاظ میں اسکی اس پاکیزہ جذبہ کا اظہار ہے کہ بدعملیوں سے ترک کا متمنی ہے کہ شیطان کے دخل سے نجات پاکر عباداللہ میں داخل ہو جاوے جس کے متعلق فرمایا گیا ہے ان عبادی لیس لک علیہم السلطان

او شیطان میرے بندوں پر تجھے قدرت حاصل نہ ہو گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن اس ابتدائی حالت میں جب اس جد وجہد میں مصروف رہتا ہے اور تھکتا نہیں تب اللہ تعالیٰ اسے وہ مقام عطا کرتا ہے۔

مریم کی مثال

جس کو یہاں مریم بنت عمران سے مماثلت دیگئی ہے کہ جب مومن اپنے زوج کی حفاظت کرتا ہے تو اسے ایک مقام عفت وعصمت عطا کیا جاتا ہے اور شیطان کے تسلط سے محفوظ ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی بدی سے بچ جاتا ہے تب اسے وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی روح اس میں پھونکی جاوے یہ وہ مقام ہے جہاں مومن صفات الٰہیہ کی تجلی اپنے وجود میں پاتا اور محسوس کرتا ہے اور خود اس کا وجود مصدق ہو جاتا ہے کلام الٰہیہ کا اور کتب سماویہ کا اس لئے وہ ان پر پورا عمل کرتا ہے۔

میرا ایک واقعہ

میں ۱۹۲۵ء میں یورپ گیا ۱۹۲۶ء میں ابھی لنڈن میں تھا کہ ایک عورت میرے پاس ہائیڈ پارک میں آئی اور اس نے معذرت کر کے مجھ سے اپنا مقصد بیان کیا کہ میں پہلے مریم تھی اب خود مسیح ہو گئی ہوں اور مسیح مجھے کہتا ہے کہ تو اس شخص کے پاس جا۔ میں نے اس کو کہا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک

آدمی اپنے کمال ایمان اور صلاحیت علم کی وجہ سے مریم صفت ہو جائے اور پھر
ترقی کرے اپنے روحانی کمالات میں تو وہ مسیح ابن مریم ہو جاوے مگر تم
وہ نہیں ہو۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ میں نے کہا اگر تم مسیح بن گئی ہوتی تو وہ
تمہیں میرے پاس آنے کو نہ کہتا۔ میں نے ایک ایسے مسیح کو دیکھا ہے جو پہلے مریم
تھا اور پھر خود مسیح ہو گیا ہو سکتا ہے کہ تمہاری روح نے اسی لئے میری طرف،
آنے کا اظہار کیا ہو۔

یہ بڑا لمبا قصہ ہے وہ ایک بڑے خاندان کی لڑکی تھی اور اس کا
باپ کسی زمانہ میں فرانس میں سفیر تھا اس نے مجھے کہا کہ تم یہاں چرچ قائم کرو
میں اس پر روپیہ خرچ کر دوں گی۔ میں نے کہا کہ میں چرچ ٹیرن نہیں ہوں
یہ واقعہ تو ضمناً مریم وابن مریم کے ذیل میں آگیا اللہ تعالےٰ نے مومنین
کو ان دونوں مثالوں میں ان کے مقام کی تمثیل دی ہے۔

والله اعلم بالصواب

(۱۶) قرآن کریم کی تاثیری قوت کی مثال

قرآن کریم اپنے اندر عمل تعمیر رکھتا ہے۔ لیکن تعمیر کے لئے بعض ان روکوں کو دور کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اس مقصد کے لئے بھی اس کے اندر ڈائنامیٹک قوت ہے جس نے ایک ایسا انقلاب کیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ قرآن کریم اس کا اظہار ایک عملی، مثال سے کرتا ہے۔

فرماتا ہے سورہ حشر پارہ ۲۸ آیۃ ۲۲

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو اسے اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرا ہوا اور پھٹا ہوا دیکھتا اور ہم یہ مثالیں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ فکر کریں۔

تشریحی نوٹ یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی عملی تاثیرات کی پہاڑوں کے گرنے سے مثال دی ہے۔ اور بتایا ہے قرآن کریم کی امثال میں حکمت و معرفت کے خزانے ہیں جو اہل فکر کو دعوت فکر

دیتے ہیں۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے ایک دوسرے رنگ میں سورۃ الرعد پارہ ۱۳ آیۃ ۳۱ میں اس طرح پر بیان فرمایا

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَاْيْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ

اور اگر کوئی قرآن ایسا ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ پہاڑ دور کر دیئے جاویں یا اس سے زمین کاٹ دی جاوے یا اس کے ذریعہ سے مردوں سے باتیں کی جاویں (تو یہی وہ قرآن ہے) بلکہ سب باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔

حقیقت جبال

ان آیات میں قرآن کریم نے جبل کا لفظ ان بڑے آدمیوں پر بولا ہے جو قرآن کریم کے لائے ہوئے انقلاب میں روک ہو سکتے تھے یا ہر قسم کی روکیں جو پہاڑ کی طرح قائم ہوں قرآن کریم ان روکوں کے دور کرنے کا ہی دعوٰے نہیں کرتا۔

بلکہ وہ اپنی قدسی تاثیرات کے ذریعہ ان بڑے بڑے لوگوں کو جو اپنے عقاید اور آبائی رسوم میں پہاڑ کی طرح قائم تھے اپنی جگہ سے ہلا کر خشیت اللہ پیدا کر کے ان پتھروں سے راستی اور پاکیزگی اور روحانیت کے نہروں کو جاری کر دیا۔ اور وہ جو روحانی طور پر مر چکے تھے ان کو زندہ کر دیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ

تاریخ اس پر شاہد ہے

کہ عرب کی مردہ قوم اور اس کے بڑے بڑے جہال کو اپنے مقام کبر و تعلی سے گرا کر اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز کر کے دنیا کے لئے رحمت کے چشمے بنا دیا اور ہر قسم کے رسم و رواج کے طوق و سلاسل ان کے گلے سے اتار دئے۔

وللہ الحمد اولاً و آخراً

امثال القرآن کا ایک اور اسلوب

امثال القرآن کا ایک اور اسلوب

میں نے قرآن مجید میں بعض بیان شدہ امثال کا ذکر کیا ہے اور ان
پس منظر میں جو تعلیم و تذکیہ مقصود ہے اسے بھی بیان کیا ہے اس خصوص میں
قرآن مجید ایک اور اسلوب بیان بھی اختیار کرتا ہے۔ یہ اسلوب بظاہر نواہی
کے رنگ میں ہے مگر مقصد کو قریب الفہم کرنے کے لئے امثال کو بھی شریک رکھا ہے
اس سلسلے میں میں چند امثال بیان کروں گا اور یہ گویا ایک رہنمائی ہوگی۔
قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر غور کرنے کے لئے

پہلی مثال | سورہ آل عمران پارہ ۴ رکوع ۸ آیۃ ۱۵۵، ۱۵۶

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا
لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ
كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ
حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ
لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۝

مومنو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور انہوں نے
اپنے ان بھائیوں کے متعلق جو شہر میں ہوں یا میدان جنگ میں اور انہیں
موت آجائے تو کہتے ہیں اگر وہ ہمارے ساتھ رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے
(اور یہ اظہار اسی لئے ہے کہ) ایسے کہنے والوں کے قلوب میں ایک حسرت ہو جائے

موت وحیات تو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے اور تم جو کچھ اعمال کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے (اس سے مخفی نہیں) (۱۵۵)

اور یاد رکھو) اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہو جاؤ یا طبعی موت سے مر جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی مغفرۃ اور رحمت یقیناً ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کر تے ہیں (۱۵۶)

اور یاد رکھو کہ تم اپنی طبعی موت سے مر جاؤ۔ یا قتل کئے جاؤ تو آخر اللہ تعالیٰ ہی کے حضور اکھٹے کئے جاؤ گے (۱۵۷)

تشریحی نوٹ

اس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے مابین ایک امتیاز پیدا کیا ہے اور مومنوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ کافروں کا رنگ اختیار نہ کریں۔ اس لئے کہ کفر انسان کی قلبی قوت کو کھو دیتا۔ اور کمزور کرتا ہے برخلاف اس کے ایمان ایک قوت ہے جو اسے پہاڑوں سے ٹکرا دیتی ہے قرآن مجید ایمان کے ثمرات میں لاخوف علیہم ولاہم یحزنون کا مژدہ سناتا ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ جب انسان مومن باللہ ہو جاتا ہے۔ جو ساری قوتوں کا سرچشمہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر ایمان لاتا ہے کہ ساری کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے تو وہ کسی قسم کا خوف اپنے دل میں پیدا ہی نہیں کرسکتا۔ گویا ایمان اور خوف ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

موت کا خوف

اس آیت میں مومنوں کو موت کے خوف سے آزاد ہونے کی تعلیم دی ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی خوف یا موت کے خوف سے رک نہیں سکتا۔ موت کا خوف مومن کے دل سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ موت اور حیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے وہی

محی ہے اور وہی ممیت ہے اور موت کسی حالت میں خواہ انسان برج مشید میں ہو آئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اس کے لئے ایک اجل مسمی ہے اسی ایمان کے بعد اس کے قلب میں موت کا خوف نکل جاتا ہے لیکن کافر ڈرتا ہے یہاں مومنوں کو کافروں کے اس خوف کو اپنے اندر پیدا نہ ہونے دینے کی تلقین ہے

الذین کفروا کون ہیں

اس میں کسی خصوصیت کا پیدا کرنا غیر ضروری ہے بلکہ عمومیت پائی جاتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک قسم کا قانون بتایا ہے کہ کامل الایمان مومن کبھی موت سے ڈرتا نہیں اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آیات کو دیکھ کر یقین کامل اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے اس لئے وہ ہر میدان میں آگے بڑھنے سے رکتا نہیں۔ لیکن جب کوئی شخص ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو چونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کے اندر موت کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خوف سے ہی وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے غرض یہ الذین کفروا عام ہے ہو سکتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت بعض ایسے لوگ (کافر) بھی ہوں جنہوں نے اپنی بزدلی کا اظہار اس طرح پر کیا ہو۔ مگر قرآن کریم کی تعلیم کی خوبی اور کمال اس کے دائمی حقایق میں ہے۔

اس قسم کے خیالات کفار کے دل میں حسرت پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ غرض اس مثال میں جو سبق دیا ہے وہ کافر کے مقابلہ میں مومن کے عزم بلند اور ایمان باللہ کو ظاہر کرتا ہے اور فرمایا کہ

تم ان کفار کی طرح نہ ہو جانا

(۲) دوسری مثال (جو گونہ آداب النبی کی تعلیم ہے) سورۃ الاحزاب پارہ ۲۲ رکوع ۱۰ کی پہلی آیت میں بیان فرمائی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا ۝

مومنو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے موسیٰؑ کو ایذا دی پس اللہ نے موسیٰؑ کو اس سے جو وہ کہتے تھے بری ٹھیرایا اور موسیٰ تو اللہ تعالیٰ کے حضور وجیہ ہے

تشریحی نوٹ اس آیت میں آداب النبی کی ایک شان کا اظہار ہے کہ مومن کامل اپنے کردار وگفتار سے نبی کے ایذا کا موجب نہیں ہوتے

موسیٰ علیہ السلام کو کیا ایذا دی تفاسیر میں مختلف روایات اس ایذا دہی کے متعلق ہیں ان پر کسی بحث کی ضرورت نہیں سمجھتا اس لئے قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے ان واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح مختلف قسم کے سوالات حضرت موسیٰؑ سے کرتے تھے۔ مثلاً ذبح بقرہ ہی کا واقعہ دیکھ لو اس ایذا دہی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی ان آیات پر غور کرو جو بنی اسرائیل کے واقعات کے متعلق قرآن کریم میں آئی ہیں

قرآن کریم سورہ بقرہ پارہ اول رکوع ۱۳ آیۃ ۱۰۸ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۗ وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح سوال کرتے رہو جس طرح

موسیٰ سے پہلے سوال کیا گیا۔ یعنی اس کی قوم سوال کرتی تھی دیا در رکھو)
جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لیتا ہے وہ ضرور سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔
یہ بھی ایک قسم ایذا کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا اور اس کو
ایک رنگ میں ایمان کے بدلے کفر لینا قرار دیا ہے۔

گوسالہ سامری کا واقعہ دیکھ لو کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام
کو اس سے کس قدر تکلیف اور کوفت ذہنی ہوئی۔ یہ بہت سے واقعات میں
مگر میں نے اس ایذا دہی کے سوال کو عام فہم بنانے کیلئے قرآن کریم ہی کی روشنی
میں واضح کیا ہے اور کسی قدر اور تصریح کر کے اس کو ختم کر دیتا ہوں۔
کہ میری ان تالیفات سے یہ مقصد بالخصوص میرے زیر نظر ہے کہ احباب،
خود قرآن کریم کے حقایق و معارف پر میرے پیش کردہ اصول کے،
مد نظر غور کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایذا دہی کے متعلق تفصیلات میں
جانے کی ضرورت نہیں حضرت موسیٰؑ کی ایذا دہی کو حقایق کی روشنی
میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل میں کامل فرمانبرداری،
کی روح کمزور تھی اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک اولوالعزم نبی کو اس
سے کس قدر تکلیف ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہدیا۔

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝

(سورۃ المائدہ پارہ ۶ رکوع ۴ آیۃ ۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبوبت میں گوسالہ پرستی وغیرہ نے

اسرائیل کی اخلاقی کمزوریوں کا تفصیلی ذکر قرآن کریم میں ہے۔ تو ان تمام کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح ایذا نہ دو۔ میں نے بطور کلام کلی کے یہ نکتہ بتا دیا ہے۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسکی طرف رہنمائی کی ہے۔ میں دوسرے کسی ایسے مفہوم کا انکار نہیں کرتا۔ جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جلال وجمال کا مظہر ہو۔

میرے ان معنوں کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے صحابہ نے عرض کیا ہم ایسا نہ کریں گے جو اصحاب موسیٰؑ نے کہا تھا۔ ہم آپ کے دائیں بائیں۔ یعنی آپ کی حفاظت کے لئے ہر طرح پر دشمن کا مقابلہ کریں گے وہ بہت سے سوالات حضرت موسیٰ سے کرتے تھے قرآن مجید نے اسکی شناعت کی اور فرمایا

سورہ بقرہ پارہ اول رکوع ۱۳ آیۃ ۱۰۹

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۝

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح سوال کرو جیسے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کئے گئے (یاد رکھو) جو کوئی ایمان کو کفر سے تبدیل کرتا ہے وہ یقیناً سیدھے راستہ سے بھٹک گیا ہے۔

احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور ایک موقعہ پر (یوم بدر یا حدیبیہ کے موقعہ پر کیونکہ احادیث میں دونوں کا ذکر ہے) ایک صحابی مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ

ہم اصحاب موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے اذھب انت وربک بلکہ ہم آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ آپ کے دائیں اور بائیں بھی آپ کے آگے اور پیچھے بھی۔ گویا عملی طور پر صحابہ نے اس حکم کی تعمیل کر دی جو اس مثال میں دیا گیا تھا۔

(۳) تیسری مثال سورۃ حشر پارہ ۲۸ رکوع ۳ آیۃ ۱۹

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○

اور (یاد رکھو) تم ان کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا پس اس نے انہیں اپنا آپ بھلا دیا یہی فاسق ہیں۔

تشریحی نوٹ

اس مثال میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا۔ اس سے پہلی آیت میں مومنوں کو تقویٰ اللہ کی ہدایت کی تھی اور یہ کہ وہ اس امر کو مدنظر رکھیں کہ انکے اعمال کا کل کیا نتیجہ ہونے والا ہے اس حکم کی تعمیل کے لئے یہاں ایک اصل تعلیم کیا ہے جیسے پہلی آیت میں اعمال کے محاسبہ کے لئے اور اعمال صالحہ کی تحریک کے لئے ایک گر بتایا تھا کہ اللہ کی اس صفت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ

وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ کو نہ بھولو

اس اصل کو جو شخص مدنظر رکھے گا وہ معصیت سے بچتا رہے گا۔ اس لئے کہ یہ ایمان اس کے اندر اس قوت کو نشوونما

دیگا کہ اللہ تعالیٰ بدعملی کو پسند نہیں کرتا۔ اس مثال میں ایک دوسرا اصل اس کی تائید ہی میں پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے طریق، عمل کو اختیار نہ کرنا

جو اللہ تعالیٰ کو بھول گئے

یہ کن لوگوں کی مثال ہے
اس مثال کا پس منظر

اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے ایک وسیع باب اخلاق و روحانیات کا رکھدیا ہے اور جب ہم قرآن مجید میں تدبر کرتے ہیں اور اس آیت کو پیش نظر رکھ کر قرآن کریم میں اس فرد یا جماعت کی تلاش کرتے ہیں۔ جن کا ذکر اس میں مرکوز ہے تو قرآن کریم کی شان بلند کا ایک نیا باب نظر آتا ہے میں اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و رحم سے اس حقیقت کا ایک حد تک انکشاف کرتا ہوں۔

نسیان سے کیا مراد ہے

پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نسیان سے کیا مراد ہے ایک نسیان تو بعض طبی اسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور یہ ایک مرض ہے گو اس کے بھی اسباب ہوتے ہیں اور وہ بعض قوانین صحت کی خلاف ورزیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن وہ نسیان یہاں مراد نہیں۔ بلکہ یہاں ایک ایسا عمل مراد ہے جس کی وجہ سے انسان عمداً اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان فیوضات سے وہ بے بہرہ ہو جاتا ہے جن کو ایمان اور اعمال صالحہ جذب کرتے ہیں۔

اب میں بتاؤں گا کہ قرآن کریم نے جو مومنین کو اس نسیان سے منع کیا تو اس کی عملی اشکال کیا ہیں۔

اول جب عالم کتاب اللہ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرے اور اپنے نفس کو بھول جاوے تو یہ بھی وہ نسیان ہے جس کے ذریعہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی نظر سے گر جاتا ہے اور اس کی تجلیات سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ سورۃ بقرہ پارہ اول رکوع ۶

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

یہ رکوع بنی اسرائیل کے متعلق ہے جس میں ان مواثیق اور ہدایات کا ذکر ہے جو انکو دی گئی تھیں۔ اور ان کے بعض علمی نقایص کا ذکر ہے۔ اور اس طرح پر حدیث دیگران کے ضمن میں مسلمانوں کو ان کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت ہے ان میں سب سے بڑی بات یہ بیان کی اور یہ خطاب علماء اسرائیل کو ہے اور انکی مثال میں علماء اسلام کو متوجہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ

کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو اور اپنی ذات کو بھول جاتے ہو بحالیکہ تم اپنی منزل من اللہ کتاب کو پڑھتے ہو پھر کیوں تم عقل سے کام نہیں کر لیتے

گویا جب واعظ قوم یا رہنمائے قوم اپنی عملی حالت کو نظر انداز کر کے دوسروں ہی کو ہدایت کرتا ہے۔ تو اس طریق عمل سے وہ اپنے نفس ہی کو نہیں اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت پر اسے ایمان ہے تو خود کیوں عمل نہیں کرتا۔

نفسی نسیان سورہ حشر کی جس آیت کی تشریح میں کر رہا ہوں اسمیں

یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کی پاداش میں ان کو اپنے نفس سے بھی غافل کر دیتا ہے اور یہی نسیان اس آیۃ میں بتایا ہے کہ ایسا شخص

دوسروں کو بے عمل ہو کر نصیحت کرتا ہے

اور اس طرح پر اپنے نفس کو بھول جاتا ہے اور نیک عمل اور اس کے ثمرات سے محروم ہو جاتا ہے۔

منافق بھی اللہ کو بھولتا ہے

اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کی حقیقت اپنے اندر نفاق کا رنگ رکھتی ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ منافق کے افعال اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کا ایک مفہوم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ توبہ پارہ ۱۰ رکوع ۹ آیۃ ۶۸ میں فرماتا ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

ترجمہ: منافق مرد ہوں یا عورتیں سب ایک ہی سے ہیں برے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا ہے (بھلا دیا) اللہ تعالیٰ نے بھی انکو بھلا دیا یہ منافق ہی ہیں جو فاسق ہیں۔

تشریحی نوٹ

اس آیت میں نسوا اللہ کے عملی طریق کو بتایا ہے کہ یہ نفاق سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے خوف کو دل سے

دور کر دیتا ہے تو وہ ہر قسم کی بدی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہی نہیں کہ وہ خود مبتلا ہو جاتا ہے۔ بلکہ دوسروں کو بھی نیک کام کرنے سے منع کرتا ہے اور بدیوں کی تحریک کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے مضائقہ کرتا ہے۔ ان اعمال بد کا محرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غافل ہو گئے جس کے لئے کہا گیا تھا

اذکروا اللہ

اللہ تعالیٰ کو یاد رکھا کرو۔ اس غفلت کا نتیجہ اس قانون مستمرہ کی رو سے یہی ہوا کہ اللہ تعالےٰ کے فضل و برکات سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کی مزید تصریح اسی سورۃ کی آیۃ ۷۵، ۷۶، و ۷۷ میں ہے جہاں فرمایا کہ انسان اس قسم کا وعدہ کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ فضل کرے تو ہم اس مال کو اسکی راہ میں صدقہ کریں گے اور ہم اچھے اعمال کرنے والے ہوں گے۔ لیکن جب اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے انہیں دیتا ہے تو بخل کرتے ہیں اور اپنے اس عہد سے پھر جاتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ دائمی ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ اللہ کے حضور حاضر ہوں یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالےٰ سے وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور جھوٹ بولتے رہے۔

اس آیۃ میں اللہ تعالیٰ نے نفاق کے پیدا ہونے کے اسباب بیان کئے ہیں ـــ اور یہ بتایا کہ نفاق بعض اعمال بد کا ردعمل ہے جو بطور

سزا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ وعدہ کو ایفا نہیں کرتا اور جھوٹ بولتا ہے
اس طرح یہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور حسنات سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم
نے دوسرے مقامات پر بھی اس نسیان کی وضاحت کی ہے۔ میں ذیل
میں بعض مقامات کے حوالہ جات دیکر ان کا ترجمہ لکھدیتا ہوں اور بعد
میں مناسب ہوا تو ایک مختصر نوٹ لکھدوں گا۔

(۱) پارہ ۷ سورۃ الانعام رکوع آیۃ ۴۴

جب انہوں نے اس نصیحت (ذکر) کو جو انہیں دیا گیا تھا بھلا دیا (ترک کر دیا)
ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھولدئیے یہاں تک کہ وہ اس عطیہ پر خوش
ہو کر آپے سے باہر ہو گئے۔ تو ہم نے (مکافات عمل کے طور پر) ان کو اچانک پکڑ لیا
تب وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔"

اس مقام پر اس نسیان اللہ کے مزید اسباب بیان کئے ہیں اس
آیت سے پہلے اللہ تعالےٰ نے مصائب اور بلاؤں کا ایک فلسفہ بیان کیا ہے
کہ ان کا مقصد خشیت اللہ کو پیدا کرنا ہے ابتدا تو انسان ایسے ابتلاؤں
کے وقت تضرع اختیار کرتا ہے۔ مگر دور ہو جانے اور آسایش کے سامان پیدا
ہو جانے پر سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب قانون مکافات کے موافق،
پکڑا جاتا ہے تو پھر مایوس ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کو بھولجانے کا ایک نتیجہ مایوسی بھی ہے

(۲) سورۃ اعراف رکوع ۲۲ پارہ ۹ آیت ۱۶۵

پھر جب انہوں نے وہ تمام نصائح بھلا دیں (ترک کردیں) جو انہیں کیگئی تھیں
تب ہم نے ان لوگوں کو تو نجات دیدی (عذاب سے بچا لیا) جو لوگوں کو بری

باتوں سے روکتے تھے اور جو ظالم تھے ان کو ایسے عذاب میں گرفتار کر دیا جو شدید بھی تھا اور ہر قسم کی نامرادی بھی لئے ہوئے تھا اور یہ سب کچھ

نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا

(۳) اسی سورۃ اعراف کے رکوع ۷، آیۃ ۵۲ میں فرمایا

(اصحاب النار وہ ہیں) جنہوں نے اپنے دین کو بے حقیقت مشغلہ اور کھیل بنا رکھا تھا اور اس دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح یہ لوگ اس دن کو بھلا رکھا تھا۔ آج ہم بھی ان کو بھول جائیں گے (یہ کیوں؟) اس لئے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے

(۴) پارہ ۱۸ سورۃ الفرقان رکوع ۲ آیۃ ۱۹

(معبودان باطلہ جواب دیں گے) کہ تو تو پاک ہے ہر عیب سے ہمارے لئے یہ کب سزاوار تھا کہ تیرے سوا اور کارساز بناتے لیکن تو نے انکو اور ان کے اباو اجداد کو سامان عطا فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ذکر اللہ کو بھول گئے۔ اور وہ ہلاک ہونے والی ہی قوم ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دنیا کی آسائش و آرائش کے سامان انسان کو غافل کر دیتے ہیں۔ اس لئے مومن کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔

میں نے بطور نمونہ یہ چند مقامات بتا دئیے ہیں جن پر غور کرنے سے مومن ایک سبق حاصل کرتا ہے کہ اسے ہوشیار رہنا چاہئے اور غفلت کے نتائج بد کو ہمیشہ سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اور ذکر اللہ ایک ایسا نسخہ

کیمیا ہے کہ اگر انسان اس کو نہ بھولے تو وہ ہر قسم کے خسران و زیان سے بچکر

مقصد حیات کو پالیتا ہے

چوتھی مثال | پارہ ۹ سورۃ الانفال رکوع ۴ آیۃ ۲۲

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے کہا ہم سنتے ہیں (مگر انکا عمل بتاتا ہے کہ) وہ سنتے نہیں

نوٹ:۔ اس کے مفہوم اور مقصد کو سمجھنے کے لئے اس سے پہلی آیت کو غور سے پڑھنا چاہئے جس کا ترجمہ یہ ہے

"مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو۔ اور تم سن رہے ہو" (۲۰)

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہر قسم کی کامیابی اور فلاح کے حصول کو اصل مقصد نہیں بتایا جس کا ذکر پیش گوئی کے رنگ میں اس سے پہلے رکوع میں آچکا ہے۔ بلکہ ان کو یہ تعلیم دی ہے کہ حقیقی کامرانی تو **اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے**

کیوں کہ ہر قسم کی کامیابیوں کا سرچشمہ یہی اطاعت کامل ہے اور ضمناً یہ بھی بتایا کہ صدائے حق کو سننے کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ اس پر پورا عمل کیا جاوے اور عملاً اس سے اعراض نہ کیا جاوے۔ اسی حقیقت کی مزید تاکید اس ارشاد ربانی میں ہے جس کو میں نے چوتھی مثال کے ضمن میں پیش کیا ہے۔

سمعنا و لایسمعون سے کیا مراد ہے۔

یہ امر کہ ایک شخص سنتا ہے اور باوجود سننے کے کہا جاوے کہ نہیں سنتا اس کا مفہوم ہر قوم اور ہر زبان میں یہ ہے کہ سننے سے مراد اس پر عمل کرنا ہوتا ہے اور جب انسان عمل نہیں کرتا تو گویا سنتا ہی نہیں جو سنی کو ان سنی کر دیتا ہے قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو اس سے اگلی آیۃ میں شَرَّ الدَّوَابِّ فرمایا کہ تمام جانداروں سے یہ بدترین ہیں۔ اور بہرے اور گونگے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ گویا سننے سے مراد اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ عقل و فکر کی قوتیں ترقی کریں۔

وہ لوگ کون ہیں جنکی مثال یہاں دی ہے

قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یہ مثال عام بھی ہے اور خاص بھی عام تو اس طرح پر کہ ہر بدعمل انسان کی مانند نہ ہو بلکہ جب اعمال صالحہ کی ہدایت اور امر معروف اور نہی عن المنکر کیا جاوے تو اس پر عمل کرو۔

اور خصوصیت سے یہ بنی اسرائیل کے طرز عمل سے بچنے کی ہدایت ہے چنانچہ قرآن مجید سورۃ النساء، رکوع ۸ آیت ۴۶ میں فرماتا ہے۔

"ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے۔ بعض کلمات کی ان کے اصل موقعوں سے تحریف کرتے ہیں اور پھر زبان سے کہتے ہیں۔ ہم نے سن لیا۔ (اور عملاً بتاتے ہیں) کہ نہیں مانتے۔"

اس حصہ آیت میں سماعت کے خلاف عمل کرنے کو عصیان کہا ہے اور یہی مفہوم ہے۔ لا یسمعون کا اس طرح پر اس مثال میں یہود کی بدعملیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے اور آگے اس رکوع میں حضرت نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کو حیات حقیقی اور دائمی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

پانچویں مثال: پانچویں مثال اسی سورۃ الانفال پارہ ۱۰۔ رکوع ۲ کی آیت ۴۸ میں ہے

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَّ
رِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ
بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فخر سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے اور انکی حالت یہ ہے کہ (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے کرتوتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اس رکوع میں آیت ۴۵ سے لے کر اس آیت تک کامیابی اور قومی فلاح کے اصول تعلیم کئے ہیں۔ اور ان مضرتوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے اور یہ اس آخری آیت ۴۸ میں بتایا آیت ۴۵ سے ۴۷ تک پانچ باتیں بیان کی ہیں۔ (قارئین کرام قرآن کریم میں اس رکوع کو دیکھ کر پڑھیں)

(۱ و ۲) ثبات قدم اور استقلال سے جمے رہو۔ میدان جنگ کی کامیابی کے لئے یہ مقدم ہے۔ صرف ثبات قدم پر ہی نازاں نہ رہو۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثیر کرو۔ اس سے خود ثبات قدم بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ذکر اللہ قلب میں قوت اطمینان کو ترقی دیتا ہے۔ (۳) اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کرو۔ (۴) باہم جھگڑا نہ کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا نکل جائے گی۔ (۵) مشکلات میں صبر سے کام لو ہمت بلند رکھو۔

یہ پانچ باتیں تو اختیار کرنے کی ہیں اور چھٹی بات اس چیز سے روکنے کی ہے جو اسباب کامیابی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور وہ اس مثال میں ہے اور مسلمانوں کو بتایا کہ

ریا اور نخوت سے ہمیشہ بچتے رہو

چھٹی مثال | سورۃ آل عمران پارہ ۴ رکوع ۱۲ آیۃ ۱۰۴

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

اور ان لوگوں کا طریق عمل اختیار نہ کرنا۔ جنہوں نے تفرقہ کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن دلایل آچکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے عذاب عظیم ہے۔

اس رکوع میں قومی ترقی اور کامیابی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ اور وہ چیز جو اس راہ میں روک ہو جاتی ہے اس سے تنبیہ کیا ہے اور اسلام کا نصب العین بتایا گیا ہے (سارے رکوع کو پڑھو)

حقیقی اسلامی روح کے عملی ذرائع۔

حقیقی اسلامی روح پیدا کرنے کے لئے ایک عملی زندگی کی ضرورت ہے اور وہی زندگی کامرانی کا ذریعہ ہے ان اصولوں میں فرد اور جماعت کے الگ الگ فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ اولاً بتایا کہ ہر فرد قوم اپنی زندگی میں تقوی اللہ اختیار کرے جو اس کا حق ہے یعنے کامل متقی کی زندگی بسر کرے۔ اور اس کی زندگی ہر لحظہ ایک حقیقی مسلم کی زندگی ہو۔ تاکہ جب بھی اسے موت آئے

وہ کامل فرمان بردار اپنے رب کا ہو۔

اس کے بعد جماعتی اصول کامیابی بتائے کہ تم میں قومی اتحاد ہو انفرادی زندگی تقویٰ وطہارت کی زندگی ہو لیکن جب تک ساری قوم اسی رنگ میں رنگین اور اتحاد باہمی میں ایک ہی فرد کا حکم نہ رکھتی ہو۔ کامیابی نہیں ہوسکتی۔ غرض مشترک کے لئے ساری قوم بہ حیثیت مجموعی ایک ہی مرکز پر جمع ہو۔ اور ان میں باہم تفرقہ نہ ہو۔ اور سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ اتحاد قومی کے ساتھ

دعوت و تبلیغ کا سلسلہ ہو

اور اس مقصد کے لئے ایک مخصوص جماعت ہو۔

ان اصولوں کے بیان کے بعد فرمایا کہ یہ تو تمہارے عمل کی باتیں ہیں ایک اور چیز ہے جس سے تم کو بچنا چاہئے اور وہ ہے

تفرقہ قومی برنگ مذہب

اتحاد قومی کی تعلیم دی جاچکی ایک دائمی اسلام جماعت کے قیام کا حکم دے دیا گیا ان ساری چیزوں کو برباد کر دینے والا وہ تفرقہ اور اختلاف ہے جو مذہب کے نام سے کیا جاتا ہے یا اختلاف عقاید کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ اتحاد باہمی ہو اور جب اصول پر لوگ متفق ہیں تو فروعات میں اختلاف تمہارے قومی اتحاد کو توڑنے کا ذریعہ نہ ہو اس مثال میں اللہ تعالےٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ اس وقت مذاہب کے اختلاف کی بنا پر جھگڑے پیدا

ہوتے اور امن عامہ کو تباہ کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس خطرناک بیماری سے بچنے کا حکم دیا تھا مگر افسوس وہ اس میں مبتلا ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے موافق

عذاب عظیم میں مبتلا ہیں

اللہ تعالیٰ اس بلا کو دور کرے۔

سانویں مثال | سورۃ النحل پارہ ۱۴ رکوع ۱۳ آیت ۹۲

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۚ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۚ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○

اور تمہاری عملی مثال اس عورت کی سی نہ ہو جاوے جس نے بڑی محنت اور طاقت سے سوت کاتا ہو۔ اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ایا۔ (سنو) اپنی قسموں کو باہم فساد کا موجب بنا لیتے ہو اس لئے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے (اپنی طاقت و جماعت کے لحاظ سے) بڑھ گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس طریق پر (تمہارے اعمال کی) آزمائش کرتا ہے۔ اور قیامت کے دن ضرور وہ تمام باتیں کھول دے گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔

تشریحی نوٹ | اس مثال میں ایک عورت کا ذکر ہے جو بڑی محنت و مشقت سے اپنے کاتے ہوئے سوت کے ٹکڑے،

کراتی تھی۔ یہ عورت فی الحقیقت کوئی تھی یا نہیں میں اس بحث میں نہیں جاتا اس لئے کہ قرآن کریم ایک تعلیمی روح رکھتا ہے اور مثال کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا میں اس کتاب کے ابتدائی بیان میں بھی واضح کر چکا ہوں۔

معاہدات کی رعایت

اس رکوع کو غور سے پڑھا جاوے تو یہ مسئلہ مثال بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ہدایات و تعلیمات دائمی ہیں کسی خاص وقت کیلئے نہیں ہیں اس رکوع میں بڑا زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ معاہدات کی خاص طور پر پابندی کی جائے۔ اور کسی بھی حالت میں ان کو توڑا نہ جاوے معاہدات کی رعایت اور حفاظت تعلیم اسلام کا ایک جزو اعظم ہے کہ اس پر دنیا کے امن کا انحصار ہے۔

معاہدات خواہ کسی قسم کے ہوں سیاسی بین الاقوام یا بین الافراد ہر حالت میں ان کا احترام ضروری قرار دیا گیا۔ اور معاہدات کی حفاظت اور پابندی کا حکم دینے سے پہلے اس رکوع میں ایک اصول نیکی کا بتایا گیا ہے جو اِنَّ اللّٰہَ یامر بالعدل والاحسان و ایتائی ذی القربیٰ میں تعلیم کیا ہے۔ اور اس کے تین مدارج قائم کئے ہیں۔ معاہدات میں بھی اسی اصل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ معاہدہ کے متعلق احکام آیت ۹۰ سے شروع ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ

عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ؕ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ٥

اور جب تم باہم عہد کر لو تو یہ گویا عہد اللہ ہے۔ پس اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کر لینے کے بعد مت توڑو۔ بحالیکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن قرار دے چکے ہو۔ اور یاد رکھو اللہ تعالےٰ تمہارے افعال کو خوب جانتا ہے

عہد اللہ سے کیا مراد ہے

اگرچہ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر جہاں عہد اللہ کا ذکر کسی نہ کسی رنگ میں آیا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اللہ سے اسلام مراد ہے اور اسلام کا لفظ اپنی وسعت کے لحاظ سے ان تمام احکام کو اپنے اندر رکھے ہوئے ہے جو تعلیم اسلام میں دیئے گئے ہیں۔ مگر اس مقام پر اذا عاہدتم کہہ کر اس وسعت کا اظہار کیا ہے کہ

جب تم کسی فرد یا جماعت سے کوئی معاہدہ کرو تو چونکہ نفس معاہدہ تعلیم اسلامی کا ایک جزو اعظم ہے۔ تو وہ معاہدہ اگرچہ فرد یا جماعت سے ہو مگر عہد اللہ کے ذیل میں آجاتا ہے اور یہ ایسا عہد ہے کہ اللہ تعالےٰ کے حضور تم اس کے جواب دہ ہو چکے۔ پس تاکید کی ہے کہ اسے مت توڑو۔

مثال کا پس منظر

یہ حکم دینے کے بعد اللہ تعالےٰ اس مثال کو بیان کرتا ہے۔ مثال کو لا تکونوا سے شروع کیا ہے۔ یہ فرد کے معاہدہ کا ذکر نہیں بلکہ قومی اور جماعتی رنگ کے معاہدات کے متعلق ایک اصولی تعلیم دی گئی۔ ان آیات کی ترتیب پر غور کرنے سے صاف

واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اس مثال میں معاہدات کی توثیق و ایفاء پر زور دیا ہے اور وہ معاہدات جو قومی یا جماعتی رنگ رکھتے ہیں انکی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے اور اس کی نزاکت میں بھی شبہ نہیں۔

ضمناً ایک پیشگوئی ہے

یہ سورۃ تو مکی ہے اور اس زمانہ کی ہے جب مسلمان نہایت ہی کمزور اور بے بس تھے۔ اس حالت میں ان کو یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی کا حکم دے کر معاہدات کی رعایت و ایفاء پر زور دینا اور معاہدات بین الاقوامی کے اصول تعلیم کرنا بتاتا ہے کہ مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ وہ کامیاب ہی نہیں بلکہ حکومتوں اور سلطنتوں کے مالک ہوں گے۔ اور انہیں مختلف اقوام سے معاہدات کرنے ہوں گے۔ اس لئے وہ تمام اصول معاہدات کے تعلیم کر دئے۔

غرض یہ مثال اسی پہلے سلسلہ معاہدات کے احکام میں ہے اور اس کی تاکید ایک ایسی مثال سے کی جو عام فہم ہے یعنے اگر ایک عورت اپنا سوت محنت کے ساتھ کاتتی رہے اور پھر آپ ہی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو اس سے بڑھ کر احمق کون ہوگا۔ پس معاہدات کو اس طرح پارہ پارہ نہ کرو اور اپنی اس محنت کو جو امن و آسایش کے نتائج پیدا کرنے والی ہے ضائع نہ کرو۔

معاہدات کے اصول

اس آیت میں معاہدات کے متعلق اصولی طور پر یہ بتا دیا کہ معاہدات کی بنا عدل۔ احسان۔ ایتا

ذی القربیٰ کے اصل پر ہو اور اگر اس اصل پر معاہدات طے پائیں تو اندیشہ فساد نہ رہے گا یاد رکھو۔

(۱) تمہارے معاہدات فساد کا موجب نہ ہوں یہ کب ہوتا ہے جب ایک قوم دوسری قوم سے اپنے سیاسی اور معاشی حالات میں بڑھ کر ہو تو وہ اس دوسری قوم کے ساتھ معاہدات کی رعایت نہیں کرتی بلکہ اسے ھضم کر جانے کا عزم کرتی ہے۔

یہاں بھی ایک پیشگوئی کا رنگ ہے کہ مسلمانوں پر ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ وہ اپنے معاشی و سیاسی حیثیت میں بڑھ کر ہوں گے لیکن انہیں اپنی اس قوت و طاقت کی بنا پر کمزور قوموں سے کئے گئے معاہدات توڑنے یا ان اقوام کو نگل جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ

یاد رکھو یہ تمہارے لئے ایک آزمایش ہو گی

اور اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اپنے معاہدات کے پورا کرنے میں پورے وفادار ثابت ہوئے۔ آج مغربی اقوام کی یہ حالت ہے کہ وہ معاہدات کو ایک کاغذ کا پرزہ قرار دیتے ہیں۔ مگر اسلام نے صحیح اصول معاہدات کے تعلیم کئے ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر ان اسلامی اصول معاہدات پر بحث کرنا نہیں بلکہ صرف اس مثال کا پس منظر بیان کرنا تھا اور وہ یہی ہے۔ کہ اس اور اس کے سیاق و سباق کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے معاہدات کو پورا کرنے پر زور

دیا ہے وہ معاہدات انفرادی یعنے بین الافراد ہوں یا قومی (بین الاقوام) اور ان معاہدات میں کسی حالت میں کمزور کی کمزوری سے فایدہ اٹھانا مقصود نہ ہو۔ کیا اس تعلیم کا کوئی دوسری تعلیم مقابلہ کرسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک

(۱۷) ایمان (حیات) کفر (موت) کی مثال

قرآن کریم نے ایمان کی مثال حیات و بصیرت اور کفر کی مثال موت سے دی ہے چنانچہ فرماتا ہے پارہ ۸ سورۃ الانفال رکوع ۱۵ آیۃ ۱۲۴

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

کیا وہ شخص جو مر چکا ہو اور ہم نے اسے زندہ کر دیا ہو اور اسکو ایک نور عطا کیا ہو جسکی روشنی میں وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہو اس آدمی جیسا ہو سکتا ہے جو ہر قسم کے اندھیروں میں گھرا ہوا ہو اور اس سے نکلتا نہیں اسی طرح کافروں کو وہ کام اچھے معلوم ہوتے ہیں جو وہ کرتے ہیں

تشریحی نوٹ اس آیت میں قرآن کریم کفر و ایمان کی مثال موت و حیات کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ قرآن مجید میں موت کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ موت جس میں روح اور جسم کی مفارقت ہو جاتی ہے اس کے بعد اس دنیا میں اس رنگ کی زندگی نہیں مردے واپس نہیں آتے یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے لیکن یہ موت جسکا ذکر اس مثال میں ہے ایسے لوگوں کی ہے جو کفر کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں

اور اپنے اعمال بد کو خوبصورت سمجھتے ہیں یہ موت کفر کی موت جہالت اور رسم و رواج اور اوہام پرستی کی موت ہے ان میں مبتلا انسان اسی تاریکی میں مر جاتا ہے۔ اور اسکے مقابل میں ایک وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان تاریکیوں سے نکلنے کی توفیق دی یہ وہ جماعت ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حیات ایمانی بخشی اور یہی نہیں بلکہ انکو ایک نور عطا فرمایا جس سے صرف وہی نفع نہیں اٹھاتے بلکہ دوسرے لوگ بھی ان سے بہرہ مند ہوتے اور اس روشنی سے استفادہ کرتے ہیں۔ کون ہے جو ان دونوں کو ایک ہی حیثیت میں قرار دے اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ایمان ایک ایسی قوت حیات رکھتا ہے کہ انسان کی تمام استعدادوں کو جلا بخشتا ہے اور اس کے علم و فہم اور بصیرت میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے تاریکی دور ہو جاتی ہے لیکن برخلاف اس کے جو شخص ان تاریکیوں ہی میں مبتلا ہے جو جہالت اور رسم کی اوہام پرستی کا نتیجہ ہے وہ اپنی بدعملیوں ہی کو پسند کرتا ہے

قرآن کریم نے دوسرے مقامات میں اسکی مزید تفصیل کی ہے کہ بدعمل لوگ اپنے اعمال کو خوبصورت سمجھتے ہیں اسی سورۃ الانعام رکوع ۵ آیۃ ۴۳ میں فرمایا

"پھر کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب ہماری طرف سے عذاب آیا تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے اور گڑگڑاتے۔ اسلئے کہ انکے دل سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے انہیں انکی بدعملیوں کو خوبصورت کر کے دکھلایا تھا"

ایسا ہی مومنوں کو نور دیئے جانے کے متعلق بھی قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اسکی صراحت کی ہے اور خود قرآن کریم ہی ایک نور ہے میں ایک حوالہ یہاں دیتا ہوں سورہ حدید پارہ ۲۷ آیۃ ۲۹

مومنو! تقوی اللہ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کرے اور تمہارے لئے نور پیدا کر دے جس کی روشنی میں تم چلو گے"

اور پھر اسی سورۃ حدید کی آیتہ ۱۲ میں فرمایا

"جس دن مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ انکا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہو گا اور ان کے دائیں بھی آج تمہارے لئے بشارت ہے ان باغوں کی جو سدا بہار ہیں اور انکے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ یہی تو فوز عظیم ہے۔

الغرض اس مثال میں کفر اور ایمان کی مثال موت اور حیات سے دی ہے۔

امثال القرآن اور حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اتقان میں ایک نوع امثال القرآن پر بھی لکھا ہے جنہیں کتاب کے شروع میں اس کا ذکر کیا ہے۔ میں بطور نمونہ اس کا ایک اقتباس دیتا ہوں تاکہ قارئین کرام کو اس سے بھی استفادہ کا موقعہ ملے اور اتقان حدید میں تو امثال کی تصریح و توضیح پڑھ ہی رہے ہیں۔

فصل امثال القرآن دو قسموں کی ہیں (۱) ظاہر جسکی تصریح کر دیگئی (۲) کامن (پوشیدہ) کہ اس میں مثل کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا قسم اول کی مثالوں میں قولہ تعالٰے مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا الآیۃ ہے کہ اسمیں منافق لوگوں کے واسطے دو مثالیں پیش کیگئی ہیں اک آگ کے ساتھ اور دوسرے بارش کے ساتھ ابن ابی حاتم وغیرہ نے علی بن ابی طلحہ کے طریق سے ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ مثال خدا تعالٰے نے ان منافق لوگوں کے واسطے بیان کی ہے جو کہ قبول اسلام سے بظاہر عزت حاصل کیا کرتے تھے اور مسلمان لوگ ان سے شادی بیاہ کرتے اور انکو میراث میں حصہ دیتے اور مال غنیمت اور مال فی کی تقسیم میں انکو شریک بنایا کرتے تھے اور پھر جبکہ وہ

لوگ مر گئے تو اللہ پاک نے اس اعزاز کو انسے اسی طرح سلب فرمالیا جس طرح کہ آگ روشن رکھنے والے شخص سے اس کی روشنی سلب کر لی اور انکو اندھیرے میں (ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ یعنی عذاب میں) چھوڑ دیا یا مثل صَیِّبٍ کے جو کہ بارش ہے اور اسکی مثال قرآن میں دیگئی ہے کہ اسمیں اندھیرا ہے،، (ابن عباسؓ کہتے ہیں یعنے ابتلا ہے) اور رعد (گرج) اور برق (چمک یعنی تخویف ہے قریب ہوتی ہے بجلی کہ انکی نگاہوں کو اچک لیجائے ابن عباس کہتے ہیں۔ یعنی قریب ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا محکم حصہ منافقین کی پوشیدہ باتوں پر دلالت کرے گا جب کہ ان کیلئے روشنی ہوتی ہے وہ اس میں چلتے ہیں (اللہ پاک فرماتا ہے کہ جس وقت منافق لوگوں نے اسلام میں کچھ عزت پائی تو وہ اسکی طرف سے مطمئن ہو رہے مگر جب اسلام کو کچھ صدمہ پہنچا تو وہ کھڑے ہو رہے (یعنے انہوں نے ابا کیا تاکہ کفر کی طرف واپس جائیں) اور اسی کی مثال ہے قولہ تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ الآیۃ ،، اور قسم اول ہی کی مثال میں قولہ ” اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا الآیۃ “بھی ہے ابن ابی حاتم نے علی کے طریق سے ابن عباسؓ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا ” یہ ایک مثال ہے جو کہ خدا تعالےٰ نے دی ہے اس میں سے قلوب نے اپنے یقین و شک کے موافق احتمال کر لیا۔ پس بہر حال زبد (جھین) تو وہ یونہی بیکار جاتا اور پھینک دیا جاتا ہے۔ اور وہ شک ہے اور بہر حال وہ چیز جو کہ لوگوں کو فائدہ دیتی ہے تو وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اور یہ شئی یقین ہے اور اسکی مثال یہ ہے کہ جس طرح زیور کو آگ میں تپا کر دیکھا جاتا ہے پھر اس میں سے خالص چیز کو نکال لیا جاتا ہے اور خراب اور کھوٹی چیز کو آگ ہی میں رہنے

دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ پاک یقین کو قبول فرمالیتا اور شکوک کو ترک کردیا کرتا ہے اور اسی راوی نے عطاؒ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا "یہ مثال خدا تعالیٰ نے مومن اور کافر کے لئے دی ہے اور قتادہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا "یہ تین مثالیں ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ایک ہی مثال میں نباہ دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ جس طرح یہ زَبَد (پھین) مضمحل ہو کر جھاگ بن گیا اور بے سود چیز ہوگیا کہ اب اسکی برکت غیر متوقع امر ہے اسی طرح باطل بھی اہل باطل سے دور ہو جایا کرتا ہے اور جس طرح کہ وہ پانی زمین میں ٹھہر کر سر سبزی پیدا کرتا ہے اور اپنی برکت کو ترقی دیتا ہے اور زمین کی سوئید گیاں برلاتا ہے یا جس طرح کہ سونا چاندی آگ میں تپانے سے میل سے صاف بن جاتا ہے اور خالص نکل آتا ہے ویسے ہی امر حق اپنے اہل کے لئے باقی رہ جاتا ہے اور انہی سونے چاندی کے میل کی طرح کہ وہ آگ میں پڑنے سے الگ ہو جاتا ہے یونہی باطل بھی اہل باطل سے جدا ہو رہتا ہے۔ اور منجملہ اسی پہلی قسم کے قولہ تعالیٰ "وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ۔ الآیۃ" بھی ہے ابن ابی حاتمؒ نے علیؓ کے طریق پر ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا یہ مثال خدا تعالیٰ نے مومن بندے کیلئے دی ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ مومن طیّب ہے اور اس کا عمل بھی طیب ہے جس طرح کہ اچھے ملک کا میوہ بھی اچھا ہوا کرتا ہے اور وَالَّذِیْ خَبُثَ یہ مثال کافر کیلئے دی گئی ہے کہ وہ ریگستانی اور شور زمین کے مانند ہے اور کافر خود ہی خبیث ہے تو اس کے عمل بھی خبیث ہوں گے۔ اور قولہ تعالیٰ "اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ الآیۃ" اس کے بارہ میں بخاریؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی

ہے کہ انہوں نے کہا ایک دن عمر بن الخطابؓ نے اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ "تم لوگوں کے نزدیک یہ آیت کس کے بارہ میں نازل ہوئی ہے أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ۔ صحابہؓ نے جواب دیا" اللہ پاک خوب جاننے والا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہٗ اس بات کو سن کر خفا ہوئے اور انہوں نے کہا یہ کوئی بات نہیں بلکہ صاف کہو کہ ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے ابن عباسؓ اس بات کو سن کر بولے میرے دل میں اسکی نسبت ایک خیال ہے عمرؓ نے فرمایا تو کہو اور اپنے نفس کو حقیر نہ بناؤ ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ ایک امر کے بابت یہ مثال دیگئی ہے عمرؓ کس امر کی بابت ابن عباسؓ ایسے مال دار آدمی کی بابت جس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت پر عمل کیا اور پھر خدا نے اسکی طرف شیطان کو بھیجا تو اس شخص نے گناہوں میں منہمک ہو کر اپنے نیک اعمال کو شامت گناہ کے دریا میں غرق کر دیا۔

میری آئندہ

تالیفات کا پروگرام

اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور صحت و توانائی کی نعمت سے نوازا اور میرے علم و فہم میں برکت دی تو آئندہ مندرجہ ذیل کتابوں کی اشاعت کا عزم ہے۔

۱۔ احکام القرآن حصہ دوم ۲۔ تاریخ القرآن

۳۔ حیات احمد کی تیسری جلد ۴۔ رحمۃ للعالمین جلد سوم

ان کے علاوہ تصوف پر بھی ایک کتاب زیر غور ہے اور قرآن مجید کے پانچ پاروں کی تفسیر یعنے ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں تاکہ آخر کے سولہ پارے مکمل ہو جائیں ان کے علاوہ ایک بہت بڑا عزم ہے اسکی توفیق مل گئی تو میرے جاننے والوں کو حیرت ہو گی کہ اس مشتِ خاک نے کیا کرشمہ دکھا دیا۔ اس کیلئے طالب دعا ہوں۔ میری امیدوں کا سہارا اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اب تک جو کچھ ہوا اسی کے فضل سے ہوا اور آئندہ بھی اسی کے فضل سے ہو گا۔ اور ہیچ ہی ہے

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

خاکسار: عرفانی الکبیر سکندرآباد

ادارہ حقائق و معارف قرآنیہ کی تالیفات

جو اس وقت موجود ہیں

۱	اسماء القرآن فی القرآن .... قیمت	۳؍
۲	قرآنی دعاؤں کے اسرار .... ؍؍	۳؍
۳	اعجاز القرآن باثبت بالقرآن .... ؍؍	۳؍
۴	البیان فی اسلوب القرآن .... ؍؍	۳؍
۵	کتاب الزکوٰۃ .... ؍؍	۱؍
۶	کتاب الحج .... ؍؍	۳؍
۷	کتاب الصیام .... ؍؍	۱۲؍
۸	کتاب الآداب .... ؍؍	۱۲؍
۹	احکام القرآن حصہ اوّل .... ؍؍	۸؍

پورا سٹ خریدنے والوں سے صرف ۵ روپئے
لئے جاویں گے۔

دفتر الحکم
عیدگاہ روڈ کراچی
پاکستان

عرفانی الکبیر
الہ دین بلڈنگ
سکندرآباد (دکن)

ادارہ حقائق و معارف قرآنیہ

اے بے خبر ز خدمت قرآں کمر ببند
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

قرآن کریم کے حقائق و معارف کی اشاعت کا ایک جوش اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے دیا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن کریم کے قریباً چودہ پاروں کا ترجمہ اور تفسیر شائع کر چکا ہوں اور بعض مخصوص مضامین پر پانچ مستقل رسالے (۱) اسماء الحسنیٰ (۲) مصطلحات قرآنی کی فلاسفی (۳) اسماء القرآن فی القرآن (۴) قرآنی دعاؤں کے اسرار (۵) البیان فی اسلوب القرآن (۶) اعجاز القرآن (۷) کتاب الاعراب (۸) احکام القرآن شائع کر چکا ہوں اور اب امثال القرآن شائع کرنے کی توفیق پاتا ہوں۔

میں صرف ان بزرگوں اور عزیزوں سے خطاب کر رہا ہوں جو قرآن مجید کے ساتھ عشق اور اس کے حقائق و معارف کی اشاعت کے لئے جوش رکھتے ہیں اور اس خدمت کو اپنے لئے ذریعہ سعادت و سرمایہ نجات یقین کرتے ہیں کہ وہ اس خصوص میں میرے ساتھ تعاون کریں اور اس کی یہ صورت ہے کہ اولاً اس سلسلہ کی ہر کتاب کی اشاعت کم از کم دو کاپیاں خریدیں ثانیاً دوسروں میں اس کی اشاعت کے لئے تحریک کریں ثالثاً جن بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور انہیں مال دیا ہے متعدد کاپیاں خرید کر غیر مسلموں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں اور پبلک لائبریریوں میں تقسیم کریں یہ ان کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا۔ میں صرف پچاس ایسے دوستوں کو پکارتا ہوں جو ہر رسالہ کی صرف دس دس کاپیاں خرید لیا کریں۔

میں اپنے دل میں ایک نیک مقصد کو لئے ہوئے ہوں۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے اس کے لئے سعی کرتا رہوں گا۔

وباللہ التوفیق وھو نعم المولیٰ ونعم الرفیق